ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! حادثات وسانحات سے مہینہ آغاز ہوا۔ گیاری میں برفانی تودے نے پاک فوج کی پوری بٹالین کو ڈھانپ لیا اور ڈیڑھ کلومیٹر پر پھیلی ہوئی زندہ لوگوں کی بستی آناً فاناً ان کے مدفن میں تبدیل ہوگئی۔ حادثے کی وجہ بحث طلب ہے کہ آیا کرہ ارض میں رونما ہونے والی موسمی تبدیلیاں اس کی وجہ بنیں یا اس خطے میں موجود اصل دشمن یعنی موسم کے تیوروں سے چوکنا نہ رہنے کے باعث یہ حادثہ پیش آیا۔ بھارت کے جارحانہ عزائم کے مقابل سیاچن میں فوجوں کی تعیناتی اسیّ کی دہائی میں کی گئی تھی۔ یوں گزشتہ تیس برس سے فوج اس علاقے کی حفاظت پر مامور ہے۔ ایک آزاد اسلامی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرنے والی آنکھیں اللہ کے نزدیک بے پایاں درجات کی حامل ہیں۔ اتنی تعداد میں فوجی جوانوں اور افسروں کی شہادتیں ایک قومی سانحہ ہے۔

حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ گیاری حادثے کے فوراً بعد ٹی وی چینلوں پر یہ بحث شروع کردی گئی کہ سیاچن میں فوجیں رکھنے سے کیا حاصل ہو رہا ہے اور کیا اس جنگ سے نکل آنا بہتر نہیں۔ میاں نواز شریف نے نہایت پھرتی سے یہ مشورہ دے ڈالا کہ پاکستان کو یکطرفہ طور پر سیاچن سے فوجیں ہٹا لینی چاہئیں۔

تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ قوموں کی قوت ارادی کو توڑنے کے لیے مغربی اقوام نے ہر دور میں انتہائی غیر اخلاقی بلکہ غیر انسانی اور مجرمانہ ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں اور حیاتیاتی جنگ تو ان کا برسوں پرانا طریق کار ہے۔ اسی لیے پاکستان میں وسیع پیمانے پر زلزلہ، سیلاب اور ڈینگی وائرس جیسی آفات کے موقع پر بھی یہی خیالات گردش کرتے رہے کہ انتہائی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی اور سائنسی آلات کے اس دور میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ عالمی سیاسی منظر کو دیکھا جائے تو سیاچن میں فوج کی موجودگی کے خلاف پاکستانی رائے عامہ کا دباؤ پیدا کرنا عین ہمارے دشمنوں کے مفاد میں ہے اور جدید سیٹلائٹ نظام کے ہوتے ہوئے یہ بات کسی جادوئی دنیا سے متعلق نہیں لگتی۔

بھوجا ایرلائن کی پرواز کا حادثہ ایک اور صدمہ بن کے گرا۔ کتنے ہی لوگوں کے پیارے گھڑی بھر میں جدا ہو گئے، اب جن کی صورتیں تا قیامت دیکھنے کو نہ ملیں گی۔ میڈیا پر اس حادثے کی وجوہات پر ہر پہلو سے بحث کھل کر سامنے آئی اور تحقیقات کا آغاز ہوا۔ جبکہ گزشتہ سال ہونے والی ایربلو کے حادثے کو پراسرار طور پر دبا دیا گیا تھا اور بلیک باکس بھی غائب کر دیا گیا۔ اس بار تحقیقات کے نتیجے میں امید ہے کہ حادثے کے اصل ذمہ داروں کو سامنے لایا جائے گا۔

تیسرا سانحہ لاہور ریلوے سٹیشن پر ہونے والا بم دھماکہ ہے جس میں بچوں سمیت کئی معصوم جانیں ضائع ہوئیں اور بے شمار لوگ زخمی ہوئے۔ وزارت داخلہ کی جانب سے بم دھماکے کا سلسلہ بلوچستان علیحدگی کی تحریک سے جوڑا گیا جسے بھارتی خفیہ ایجنسی کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یہ

امر بے حد تکلیف دہ ہے کہ ہم جانے پہچانے دشمن سے جانتے بوجھتے ایک بار پھر زخم کھانے کو تیار ہیں۔ جو کام را نے مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی سے کروایا اب وہی بلوچستان میں علیحدگی پسندوں سے کروا رہی ہے۔ وزارت داخلہ کو اگر اتنی معلومات مل گئی ہیں تو اسے ان مذموم سرگرمیوں کا توڑ بھی کرنا چاہیئے۔

ہم تینوں حادثات میں جاں بحق ہونے والوں کے لیے دعائے مغفرت اور ان کے لواحقین کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری حالت پر رحم فرمائے اور ہمیں اپنی غضب نا کی اور ہماری شامتِ اعمال سے محفوظ رکھے آمین۔

لیاری بدستور میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ مہنگائی اور توانائی کے بحران کی حالت بھی وہی ہے۔ پٹرول کی قیمت ایک بار پھر بڑھادی گئی جس کے نتیجے میں مہنگائی کا گراف مزید بڑھتا ہے۔ معاشی زوال کا یہ سفر گویا ڈھلوان پر رکھا ہوا قدم ہے جو نیچے ہی نیچے پھسلا چلا جا رہا ہے اور جس کے نتیجے میں اخلاص اور خدا خوفی کی کوئی چٹان حائل ہوتی نظر نہیں آتی۔ پاکستان بھی عجیب ملک ہے! ایک طرف نوجوانوں میں لیپ ٹاپ تقسیم ہو رہے ہیں اور ترقی یافتہ دنیا کے ساتھ ہمقدم ہونے کا زعم ہے، دوسری جانب چوبیس شمیمہ کی بجلی بھی مہیا نہیں ہے جس کی روشنی میں طالبعلم پڑھائی کرسکیں اور یہ پاکستانی قوم ہی ہے کہ ان مضحکہ خیز حالات میں بھی جینے سے بیزار نہیں۔

بنت مجتبیٰ لقّنا کو ہم سے جدا ہوئے ایک برس گزر گیا۔ اس بار خاص مضمون ان کے بارے میں ہے جو ان کے زیرِ طبع مجموعہ کلام میں شامل ہوگا اشرف جاوید کے ان اشعار کے ساتھ اجازت دیجئے۔

میں اپنی راکھ سے اک دن نیا جنم لوں گا
دھمال ڈال رہا ہے ابھی دھواں مجھ میں
نہ جانے کون سے موسم میں رنگ لے آئے
مثالِ دشت پڑا ہے جو گلستاں مجھ میں

دعاؤں میں یاد رکھیئے

صائمہ اسما

حمیرا خالد

آخرت پر ایمان

اسلام میں ہر چیز کی قدر و قیمت آخرت کے دائمی نتائج کے لحاظ سے ہے

آخرت کیا ہے؟

ایک دن ہوگا جب اللہ تعالیٰ تمام عالم اور اس کی مخلوقات کو مٹا دے گا۔ پھر سب کو دوسری زندگی بخشے گا۔ سب اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے تمام لوگوں نے اپنی دینوی زندگی میں جو کچھ بھی کیا ہے خدا کی عدالت میں اس کا حساب پیش کرنا ہوگا جن کی بخشش ہوگی وہ جنت میں جائیں گے اور جن کو سزا ملے گی انہیں دوزخ میں جانا ہوگا۔ جو اس عقیدہ سے انکار کرتا ہے، تمام نبیوں نے ایسے شخص کو کافر قرار دیا ہے۔

انسانی زندگی میں آخرت کی اہمیت

آخرت کا عقیدہ انسان گچھیا رحمت ہے ایک عظیم نعمت ہے۔ جس شخص کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا وہ نفسیاتی لحاظ سے سخت عذاب اور کشمکش میں رہتا ہے۔ اس وجہ سے وہ گمراہی کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں بھی ایک مصیبت میں گرفتار رہتا ہے۔ دنیاوی واقعات اور حادثات انسان صرف اس عقیدہ پر ایمان رکھنے کی وجہ سے برداشت کرتا ہے کیونکہ اسے تسلی ہوتی ہے کہ ایک دن ہے جس میں بدکار کو سزا اور نیکو کار کو اجر ملے گا۔ جو شخص اس فرحت بخش تصور سے محروم ہے وہ گویا دائمی عذاب میں ہے۔

انکارِ آخرت کے اثرات

آخرت کا انکار یا اقرار انسان کی زندگی میں فیصلہ کن اثر رکھتا ہے۔ اس کے اثر سے دو مختلف بلکہ متضاد طرح کے عمل وجود میں آتے ہیں۔

آخرت پر یقین نہ رکھنے والا اسلام کے طریقے پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا کیونکہ اسلام تو کہتا ہے کہ خدا کی راہ میں زکوۃ دو غریبوں کی مدد کرو...... وہ غیث ہے زکوۃ دینے سے میرا مال گھٹ جائے گا میں تو اپنے مال پر سودلوں گا اور اپنی دولت بڑھاؤں گا۔ اسلام کہتا ہے کہ ہمیشہ سچ بولو جھوٹ سے پرہیز کرو۔ خواہ سچائی سے نقصان اور جھوٹ سے فائدہ ہی کیوں نہ پہنچتا ہو...... وہ جواب دیتا ہے جھوٹ سے اجتناب کیوں کروں اگر فائدہ مند ہوا اور سچ کس کام کا جس سے بدنامی کا خوف ہو یا شہرت خراب ہو رہی ہو۔

اسلام میں ہر چیز کی قدر و قیمت آخرت کے دائمی نتائج کے لحاظ سے ہے۔ جبکہ دنیا کی طرف بلانے والوں کے پاس ہر وہ سامان ہے جس کی طرف انسانی نفس راغب ہوتا ہے۔ آخرت ایک غیر محسوس چیز ہے جو مرنے کے بعد سامنے آئے گی اور آخرت کی طرف بلانے والے کے پاس سوائے نصیحت اور تذکیر کے کچھ نہیں۔ فی الوقت نہ وہ بھیانک انجام سامنے لا سکتا ہے نہ انعام۔ دوسری طرف دنیا اپنی تلخیاں اور شیرینیاں ہر دم چکھاتی رہتی ہے۔ دنیا بگڑے تو اس کی چبھن ہمارا رونگٹا رونگٹا محسوس کرتا ہے دنیا بگڑے تو اس کا احساس ہمارے گھر والے، دوست احباب اور سوسائٹی کے عام لوگ سب مل جل کر محسوس کرتے ہیں۔ جبکہ آخرت سنورے تو اس کی ٹھنڈک گوشہ دل کے سوا کہیں محسوس نہیں کی جاتی۔

آخرت یقینی ہے

جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان رکھتا ہے وہ انکار نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی چار صفات ایسی ہیں جو روز جزا کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ان صفات کے تقاضے دنیا میں پورے نہیں ہو سکتے۔ اور وہ ہیں:

---

[1] سابق صدر شعبہ اسلامیات، لاہور کالج برائے خواتین۔

صفت عدل

عدل کے معنی ہیں کے کانٹے کی تول انصاف کیا جائے۔ یہ ممکن نہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مسلم اور مجرم دونوں کو ایک سطح پر رکھیں۔

افنجعل المسلمین کا المجرمین مالکم کیف تحکمون

(قلم:36)

جہاں تک اس دنیوی زندگی کا تعلق ہے اس میں یہ تقاضا پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا یہاں تو نعمتیں خوشحالیاں سربلندیاں بالعموم ان کو نہیں ملتیں جوحق پر ہوں ان کے پر تو بدحالیاں اور مظلومتیں ہی چھائی رہتی ہیں۔

یہ صورتحال صاف کہہ رہی ہے کہ یہ دنیا دارالجزاء نہیں ہے یہاں لوگوں کو کیے کا بدلہ نہیں ملا کرتا۔ اس لیے کوئی دوسرا عالم ہو جہاں عدل الٰہی کا بنیادی تقاضا پورا ہو اور ہر ایک کو پورا پورا انصاف ملے۔

صفت حکمت

حکیم اسے کہتے ہیں جس کا کوئی کام حکمت اور مقصد سے خالی نہ ہو۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کو حکیم مانا جائے تو یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اس دنیا اور اس میں بسنے والی نوع انسانی کی تخلیق بے مقصد ہی کر دی ہو۔

کیا یہ بات قابل تسلیم ہے کہ اس نے انسان جیسی مخلوق کو صرف اس لیے پیدا کیا ہو کہ دنیا میں کھائے پیئے اور ایک روز مر کر فنا ہو جائے۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ دنیا کے اس عظیم اور منظم کارنے کو ایک روز یونہی توڑ پھوڑ کر ختم کر دینے کیلئے پیدا کیا ہو؟

افحسبتم انما خلقنکم عبثا و انکم الینا لاترجعون

(مومنون 115)

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم بلا کسی مقصد کے پیدا کیے گئے ہو اور تمہیں ہماری طرف لوٹ کر نہیں آنا؟

صفت رحمت

رحمت اور شفقت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ جو فرمانبردار ہوں ان کی طاعتوں اور قربانیوں کی پوری پوری قدر کی جائے انہیں اچھی طرح خوش کر دیا جائے۔

لیکن اس دینوی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا یہ تقاضا عموماً پورا نہیں ہوا کرتا۔ اور واقعات یہی بتاتے ہیں کہ فرمانبرداروں کو مشکلات اور مصائب سے ہی بکثرت سابقہ رہتا ہے۔ بلکہ بعض کی تو پوری زندگی ہی تلخیوں میں گزر جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے رحیم ہونے کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ لازماً ایک یوم جزا آئے جب اس کی رحمانیت انہیں اپنی آغوش میں لے کر دینوی زندگی کے سارے رنج وغم کا غبار جھاڑ دے۔

صفت حاکمیت

اللہ تعالیٰ کی صفت حاکمیت کا وجود جزا وسزا کے تصور کے بغیر بے معنی ہے۔ جب تک کہ اس کی مسلسل نافرمانیاں کرنے والے بلکہ اس کے مقابل علم بغاوت بلند کرنے والے اس کے سامنے حاضر تک نہ ہوں۔

آخرت سے بے نیازی کا نتیجہ

دینی زوال کی ابتداء ایمان بالآخرت ہی کے زوال سے ہوتی ہے فکر آخرت سے انسان کا ذہن جوں جوں غافل ہوتا ہے نماز سے اس کا رشتہ کٹتا چلا جاتا ہے۔ پھر نماز سے جتنا جتنا دور ہو گا پوری شریعت سے تعلق ختم ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ نفس اس کا معبود بن جاتا ہے اور نفس کی خواہشات اس کیلئے دین وشریعت بن جاتی ہیں۔

ترجمہ: انہوں نے نماز ضائع کر دی اور اپنی خواہشوں کے پیرو بن کر رہ گئے۔(مریم:59)

گویا جس نے نماز ضائع کر دی اس کا ایمان بالآخرت موت کی نیند سو گیا۔ اسی لیے کسی بے عمل مسلم فرد یا گروہ میں سب سے پہلے آخرت کی باز پرس کا احساس پیدا کیجیے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونے کا ڈر پیدا کر لیا تو گویا سب کچھ کر لیا۔ اب وہ دین کے ایک ایک تقاضے کو خود ڈھونڈتا پھرے گا۔

آخرت سے غفلت کا سبب

قرآن کہتا ہے کہ اس کا سبب دنیا کی محبت اور مفاد دنیا کی پرستش ہے۔ جب تک حب دنیا کے زہر سے دل دماغ متاثر ہے اس پر جزاوسزا کے دلائل کارگر نہیں ہو سکتے۔ دنیا پرستی وہ ناگن ہے جو قلب انسانی کو ڈس کر اس کی رگوں میں فکر آخرت سے بے نیازی کا زہر اتار دیتی ہے۔ اس کے فطری مزاج کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

جو جس چیز سے محبت کرتا ہے اس کی مخالف چیزوں کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتا۔ دنیا پرستی اور آخرت پسندی ایک دوسرے کی ضد ہیں دنیا کے پیچھے بھاگنے والا آخرت کا جویا نہیں بن سکتا۔

آخرت سے بے خوفی کا سبب

کچھ نظریے اور فلسفے ایسے ہیں جن کا سہارا لے کر دنیا پرستی کا جذبہ انسان کو آخرت فراموش بنا دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ترجمہ: یہ معبود اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں۔ (یونس 16)

یہ عقیدہ کہ انسان کی مغفرت اس کے اعمال سے نہیں ہو گی بلکہ کچھ بزرگ اور مقدس ہستیوں کے ذریعے ہو گی جو خدا کے کاروبار میں پورا پورا دخل رکھتے ہیں اس لیے ان کا دامن پکڑ لو۔ تو ان کی عقیدتوں کے گیت گاؤ ان کے مزار پر سجدے کرو اور نذریں چڑھاتے رہو۔ اس کے بعد مطمئن ہو کر زندگی میں جو چاہو کرو، دین اور دنیا کی سعادت مندیاں تمہارے لیے یقینی ہیں۔ یہاں اصل مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ بندگی کی تمام تر ذمہ داریوں سے بچا جائے اور مفاد دنیا میں بھی رکاوٹ نہ پڑنے پائے لیکن نام لیا جاتا ہے بزرگوں اور مقدس ہستیوں کی عظمت واحترام کا۔

وہ لوگ جنہوں نے قیامت کو زبانی طور پر سے ماننے اور عملی طور پر نہ ماننے کا کام بڑی خوبی سے انجام دیا ہے ان کے خیال میں ہم اللہ کے لاڈلے اور چہیتے ہیں

نحن ابناء اللّٰہ و احباء ہ (مائدہ 18)

لن تمسنا النار الا ایام معدودہ...... (بقرہ 80)

اگر کچھ سرزنش بھی ہوئی تو کتنی، چند دنوں سے زیادہ نہیں۔

پہلے دنیاوی زندگی نے انہیں اپنا گرویدہ بنایا اس کے بعد انہوں نے اپنی مغفرت کا یہ فارمولا ایجاد کیا۔ جبکہ قرآن کہتا ہے یہ سب ان کے نفس کی خواہش (امانی) ہیں جنھیں انہوں نے ذہنی تصورات کا لباس پہنا دیا ہے۔

ایمان بالآخرت کیلئے عملی تدابیر

ا۔ عمل کا احتساب کیا جائے اور بے لاگ جائزہ لیا جائے۔

انسان کا عمل وہ بیرومیٹر ہے جو بتا سکتا ہے کہ اقرار آخرت کی تہہ میں آخرت پسندی کی واقعی مقدار کس قدر ہے۔

اعمال میں سے بھی دو چیزیں ایسی ہیں جو ایمانی کیفیت کے خدوخال کا پورا مشاہدہ کرا دیں گی۔

ایک آخرت کے لئے دنیاوی مفاد کی قربانی، دوسری نماز کی اقامت۔

دنیا کو آخرت پر قربان کر سکنے کے نتیجہ میں ہمیشہ دین کے احکامات ٹھکرائے جاتے ہیں۔

قران میں فرمایا گیا ہے۔

''اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کو کہا گیا تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو گئے۔ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دینوی زندگی کو پسند کر لیا ہے۔ (التوبہ)

یعنی جانی اور مالی مفاد کے آگے دین کے تقاضے ہیچ کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر نگاہ آخرت اور اس کے انعامات پر ہوتی تو دنیا کے حقیر فائدے ہرگز نہ دیکھتے۔

دوسری چیز نماز وہ کسوٹی ہے جس پر ایمان بالآخرت کو جانچنا مشکل نہیں۔

تبھی تو قرآن کہتا ہے کہ اللہ کا خشوع اور قیامت کا اندیشہ نہ رکھنے والوں پر نماز بہت شاق ہوتی ہے۔ جسے اپنے عقیدہ آخرت کا حال پوچھنا ہو وہ دیکھے کہ صبح سے شام تک بے شمار ایسے مواقع آتے

ہیں کہ جب دنیا اپنی طرف کھینچتی ہوگی اور آخرت اپنی طرف، اب غور کر کے دیکھتے رہیے کہ اس کشاکش میں اس کے فیصلے کیا ہوتے ہیں؟ کتنے معاملات میں اپنے آپ کو دنیا کے حوالے کرتے ہیں کتنے میں مفادات کو آخرت پر قربان کر بھی دیتے ہیں تو وہ کس نوعیت کے ہیں؟ بڑی اور اہم نوعیت کے یا خدانخواستہ چھوٹی اور معمولی نوعیت کے۔ مچھروں کا چھاننا اور اونٹ کو نگل جانے کا معاملہ تو نہیں۔

اسی طرح نمازوں سے عقیدہ آخرت کی کیفیت معلوم کرنا ہو تو اس کے ظاہر اور باطن دونوں کا جائزہ لیجیے دل کی حاضری کا کیا عالم ہے۔ وقت اور جماعت کی پابندی کتنی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اور رحیمیت کے کسی من مانے تصور نے گناہوں کی طرف سے کچھ بے پرواتو نہیں بنا دیا۔ نفس نے دنیا و آخرت کے درمیان کچھ مصالحت تو نہیں کر رکھی ہے۔

شفاعت کا عقیدہ اگرچہ برحق ہے لیکن ذہن کو اس عقیدے کے صحیح قرآنی تصور سے آشناء کیا جائے۔ تاکہ جوابدہی کا درست قانون سامنے رہے۔

۲۔ یقین کی کیفیت حاصل کرنے کی کوشش مسلسل کی جائے عقیدہ آخرت کو محض باپ دادا کی ایک مقدس وراثت کی حیثیت سے گلے لگائے رکھنا ہی کافی نہیں۔ کیونکہ تقلیدی ایمان میدان جدوجہد کا سپاہی پیدا نہیں کر سکتا۔

اس شعوری ایمان اور بصیرت کو پیدا کرنے کیلئے قرآن کی طرف رجوع کیا جائے اس کے دیئے ہوئے دلائل اور کائنات کی نشانیوں پر غور کیا جاتا رہے کہ آثار کائنات پر غور و فکر کی نظر ڈالتے رہنا اہل ایمان کا امتیازی وصف ہے۔

۳۔ آخرت کے نقشے کا زندہ تصور کیا جائے...... آخرت کا علم و یقین حافظے پر پوری طرح چھا جانا چاہیے۔ مومن کو یہ بات حتی الوسع کبھی نہ بھولنے پائے کہ یوم جزا کو لازماً آنا ہے۔ لہٰذا قرآن کے ان حقوق کی حضور قلب کے ساتھ تلاوت کی جائے جن میں قیامت کی ہولناک کیفیتوں اور عذاب جہنم کے مناظر کا نقشہ کھینچا گیا ہے یاد رہے کہ تلاوت قرآن کا اعلیٰ و افضل موقع نماز کی حالت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے انتہائی قربت حاصل ہوتی ہے۔

۴۔ موت کو کثرت سے یاد کیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس چیز کو بکثرت یاد کرتے رہو جو دینوی لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔ یعنی موت...... موت کو یاد کرنے کا فطری طریقہ تو یہی ہے کہ انسان بالارادہ اپنی موت کے پیش آنے والے یقینی حادثے کی طرف اپنے آپ کو متوجہ کرتا رہے۔ خصوصاً رات کی سنسان گھڑیوں میں...... ایک دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ جس کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا۔ قبروں کو جا کر دیکھا کرو کیونکہ وہ موت کی یاد دلاتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات نہ بھولنا چاہیے کہ زیارت کیلئے صرف بزرگوں اور ولیوں ہی کی قبروں کو منتخب و مخصوص نہیں کر لینا چاہیے بلکہ ہر قبر عبرت اور موت کی یاد دلانے والی اور آخرت کا خوف ابھارنے والی بن سکتی ہے۔ عام قبریں بزرگوں کی قبروں سے زیادہ اس غرض کیلئے مفید اور موثر ثابت ہو سکتی ہیں۔

۵۔ دنیاوی لذتوں سے بے رغبتی اختیار کی جائے۔ حدیث ہے۔

''دنیا میں ایک اجنبی مسافر کی طرح رہو۔'' (بخاری)

اس کے لیے سب سے پہلی چیز ارادے کی قوت ہے جس دنیا کی ایک ایک ادا اپنے اندر بلا کی کشش رکھتی ہو اس کے جال سے محفوظ رہنے کیلئے بڑے مضبوط عزم کی ضرورت ہے۔

دوسری چیز دنیا کی بے وقعتی عارضی اور حقیر ہونے کا احساس ہے۔

آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کی پونجی بالکل ہیچ ہے۔ (توبہ 36)

نبی ﷺ نے مثالوں کے ذریعے مسلمانوں کے ذہن میں اس دنیا کی اصل حقیقت بٹھائی ہے حدیث کے مطابق دنیا مومن کیلئے قید خانہ ہے اور کافر کیلئے جنت۔ (مسلم)

پس آدمی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر پہچانے اور ان

پر قناعت کرے مال کی تونگری کو نہیں دل کی تونگری کو عزیز رکھے۔

تیسری تدبیر ہے کہ ایام اللہ میں تفکر کرے کہ کیسے اللہ بعض قوموں کو اٹھاتا ہے اور بعض کو گراتا ہے۔ غور وفکر کرے کہ مجھے اس دنیا کو چھوڑنا ہے۔ جس کے بعد میں اور میرے اچھے برے اعمال ہوں گے۔ یہ تدبیر اس کے نفس کو دنیا کی آلائشوں سے پاک کرسکتی ہے۔

آدمی دنیا میں ناکامی سے دوچار ہوتا ہے تو اس کو موقع ہوتا ہے کہ دوبارہ نئی زندگی شروع کرسکے۔ اس کے پاس ساتھی اور مددگار ہوتے ہیں جو سنبھالا دے لیتے ہیں مگر آخرت کی ناکامی ایسی ناکامی ہے جس کے بعد دوبارہ سنبھلنے کا امکان نہیں رہتا۔ کیسا عجیب حسرت کا لمحہ ہوگا جب آدمی یہ جانے گا کہ وہ سب کچھ کرسکتا تھا مگر اس نے نہیں کیا۔ یہاں تک کہ کرنے کا وقت ختم ہوگیا۔

زندگی کی مثال ایک ڈھلوان کی ہے جس پر سارے انسان نہایت تیزی کے ساتھ بھاگے چلے جارہے ہیں۔ ہر لمحہ جو گزرتا ہے وہ ہم کو اس آخری انجام سے قریب تر کردیتا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کیلئے مقدر ہے۔

زندگی صرف چند دن کی ہے لیکن ان چند دن کا انجام کروڑوں اربوں سال نہیں بلکہ ابدالآباد تک پر محیط ہے۔ جس کی تکلیف بے حد دردناک اور جس کا آرام بے حد خوشگوار ہے۔

(ماخوذ از ''اساس دین کی تعمیر'')

☆☆☆☆

ڈاکٹر عبداللہ محسن

عیادت ایک سعادت

بیمار پرسی، جان کنی اور موت کے مواقع نبھانے کے لیے مسنون طرزِ عمل

کیا کوئی عورت کسی مرد کی عیادت کر سکتی ہے؟

حضرت ربیعہ بنت مسعود بن عفراءؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ:

''ہم عورتیں رسول اکرمؐ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتی تھیں، مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں اور ان کی خدمت کرتی تھیں اور زخمیوں اور مقتولین کو مدینہ لاتی تھیں۔'' (صحیح بخاری کتاب الطب)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اکرمؐ مدینہ تشریف لائے تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ کو تیز بخار ہو گیا۔ میں ان دونوں کے پاس گئی اور پوچھا اے ابا جان! آپ کا کیا حال ہے اور اے بلالؓ آپ کا کیا حال ہے؟ (صحیح بخاری۔ کتاب المرض)

ایک انصاری مسجد میں رہا کرتے تھے۔ حضرت ام درداءؓ ان کی عیادت کیلئے تشریف لائیں۔ لہٰذا اگر کسی عورت کا کوئی عزیز بیمار ہو تو وہ عورت پردے اور حجاب کے احکام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی عیادت کر سکتی ہے اور اگر ناگزیر ہو تو اس کی تیمارداری بھی کر سکتی ہے (فقہ السنۃ از محمد عاصم)

عیادت کے آداب

شارع علیہ السلام نے یہ طے فرما دیا کہ بیماری کی کتنی مدت میں عیادت کا حق واجب ہوتا ہے تاکہ خواہ مخواہ معمولی باتوں پر پریشان ہو کر چل نہ کھڑے ہوں۔

''عیادت کا حق تین دن سے زائد کی بیماری میں ہے۔'' (ابن ماجہ)

حضرت انسؓ اس معاملہ میں مزید گواہی دیتے ہیں کہ:

''نبیؐ کسی مریض کی عیادت نہیں کرتے تھے مگر تین دن کے بعد۔'' (ابن ماجہ بیہقی)

ایک بڑی ہی اہم بات جس کا آج کل قطعاً خیال نہیں رکھا جاتا یہ ہے کہ عیادت میں مریض کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھیں، نہ مریض سے زیادہ باتیں ہی کرنا چاہئیں کہ اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

''بیمار کے ہاں تیمارداری کیلئے کم بیٹھنا اور کم باتیں کرنا سنت ہے۔''

ایک اور مقام پر یوں ہدایت ہے:

''بیمار کی مناسب بیمار پُرسی یہ ہے کہ مزاج پُرسی کرنے والا اس کے پاس سے جلد اٹھ آئے۔ (مسند الفردوس احمد ایلمی)

حضرت انسؓ جو خاص ہادی اعظمؐ کے تربیت یافتہ ہیں اپنے آقاؐ سے یوں نقل فرماتے ہیں:

''افضل عیادت کا وقت اس قدر ہے جس قدر اونٹنی کے دودھ دوہنے کے درمیان وقفہ ہوتا ہے۔'' (بیہقی فی شعب الایمان)

(نوٹ: یہ وقفہ بہت کم ہوتا ہے)

حضرت سائبؓ سے روایت ہے کہ میری خالہ مجھے نبی اکرمؐ کی خدمت میں لے گئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! میری بہن کے اس بیٹے کو درد کی تکلیف ہے تو آپؐ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لئے برکت کی دعا فرمائی۔ پھر وضو کیا تو آپ کے وضو کا بچا ہوا پانی میں نے پی لیا اور آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا تو میں نے آپؐ کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت کو دیکھا (صحیح بخاری)

عیادت کے عمومی آداب

☆ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کی عیادت کرنا اور غیر مسلموں کی عیادت کرنا بھی سنت نبویؐ ہے۔ عیادت اس طرح سے

اور اتنی دیر کی جائے جس سے مریض کو سکون و راحت نصیب ہو۔

☆ اگر کسی ہسپتال یا دواخانہ میں عیادت کیلئے جائیں تو وہاں کے قواعد وضوابط کی پوری پابندی کریں۔ ورنہ وہاں کی انتظامیہ مریض کو موردالزام ٹھہراتی ہے۔

☆ ہسپتال کے اوقات کی پابندی کی جائے۔

☆ اپنے مریض کے آس پاس جو دوسرے مریض ہوں ان کی خیریت بھی پوچھنی چاہیئے۔

☆ ہسپتال میں گندگی پھیلانے سے پرہیز کیا جائے۔

☆ اگر مریض خود کسی کے بیٹھنے پر اصرار کرے اور اس کے بیٹھے سے اسے سکون و راحت نصیب ہو تو زیادہ دیر تک مریض کے پاس رہنا زیادہ ثواب کا باعث ہے کیونکہ جن لوگوں سے مریض کو خاص تعلق اور محبت ہو، ان کے قرب سے اسے سکون و راحت نصیب ہوتی ہے۔

☆ مریض سے اس کی مختلف ضروریات کے بارے میں پوچھا جائے اور جس چیز کی ضرورت ہو وہ فراہم کردی جائے۔

☆ مریض سے ایسی باتیں کی جائیں جن سے اس کا دل خوش ہو۔ ان موضوعات اور مسائل کو نہ چھیڑا جائے جن سے اسے پریشانی اور ذہنی الجھن ہوتی ہو۔

☆ عیادت کے لئے جاتے وقت کوئی تحفہ ساتھ لے کر جائیں تو بہتر ہے۔

☆ اسی طرح مریض کو چاہیئے کہ وہ بھی صبر وشکر سے کام لے۔ شکوہ اور آہ و بکا سے بچنے کی کوشش کرے، حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے اللہ تعالیٰ دو فرشتوں کو اس پر اس لئے مقرر کر دیتے ہیں کہ وہ دیکھیں کہ یہ مریض عیادت کرنے والوں کے سامنے خدا کا شکر بجالاتا ہے یا شکوہ شکایت میں لگا رہتا ہے تو جب بیمار شکر کرتا ہے اور الحمد للہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اب مجھ پر واجب ہے کہ ''اگر اس بیمار کو دنیا سے جانا ہے تو اپنی رحمت کے سائے میں لے جا کر جنت میں داخل کردوں اور اگر شفا بخشوں تو ساتھ ہی اس کے گناہ بھی معاف کردوں اور پہلے سے بہتر گوشت پوست اور خون اس کے جسم کو عطا کردوں۔''

☆ مریض سے ہمت اور حوصلہ دلانے والی باتیں کی جائیں۔ ایسی باتوں سے پرہیز کیا جائے جن سے ناامیدی، مایوسی اور پریشانی میں اضافہ ہوتا ہو۔

☆ مریض کو نیک لوگوں کی بیماریوں میں صبر وشکر کے قصے سنائے جائیں۔

☆ ڈاکٹر صاحبان اور ہسپتال کے عملے کے کام میں غیرضروری مداخلت نہ کی جائے۔

☆ مریض کے پاس رونے دھونے سے گریز کیا جائے۔

☆ مریض کو بتائیں کہ بیماری میں صبر وشکر سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

☆ اگر مناسب ہو تو اس کے سامنے ہی اس کی صحت کے لئے دعا کی جائے۔

☆ مریض سے اپنے لئے دعا کی درخواست کرنی چاہیئے، کیونکہ مریض کی دعا فرشتوں کی مانند ہوتی ہے (سنن ابن ماجہ)

☆ اگر مریض کا قیام کسی ایسے گھر میں ہو جہاں اندر جانا مناسب نہ ہو تو باہر ہی سے سلام اور اطلاع کر کے واپس آجانا چاہیئے۔ مثلاً آپ کو معلوم ہے کہ مریض کے گھر میں کسی کو بٹھانے کیلئے جگہ ہے اور نہ ہی سامان۔ تو باہر سے خیریت معلوم کر کے واپس آجائیں۔

☆ ہر اس کام اور بات سے پرہیز کیا جائے جس سے مریض پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہوں۔

☆ مریض کو نماز، دعا اور اللہ کا ذکر کرنے کی مناسب انداز میں تلقین کی جائے۔

☆ ذمہ دار لوگوں کو عیادت کے وقت یہ جائزہ لینا چاہیئے کہ مریض کا مناسب انداز میں علاج ہو رہا ہے یا نہیں۔

مختصراً یہ کہ مریض آپ کی عیادت سے خوش ہو۔ یہی عیادت

کا مطلوب ومقصود ہے۔

جان کنی میں عیادت

کسی کا مرض لا علاج ہو چکا ہو اور وہ جانکنی کے عالم میں ہو تو اس وقت بھی مولیٰ کریم ہمیں اپنی ہی یاد دلاتے ہیں تاکہ جانے والے اور رخصت کرنے والوں کے ذہنوں میں یہ بات اچھی طرح واضح رہے کہ اب اگلا مرحلہ کون سا ہے، پڑاؤ کہاں ہوگا، کس کے پاس ہوگا؟

حضرت ابوسعید خدریؓ اپنے آقاؐ کی ہدایت ہم تک پہنچاتے ہیں:

''اپنے فوت ہونے والوں کے پاس لا الہ الا اللہ کے کلمات دہراتے رہو۔'' (رواہ مسلم)

یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ اقتدار اعلیٰ کس کے پاس ہے، بے پناہ قدرت رکھنے والی ذات کونسی ہے، کس کی عظمت واقتدار کے حضور سر جھکائے جاتے ہیں، کس کا حکم اور فیصلہ غالب آنے والا ہے؟ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی بے بسی و بے اختیاری پر نظر رہے، اپنے عجز پر آگاہی ہو۔ انسان جان لے کہ وہ حاکم نہیں محکوم پیدا کیا گیا ہے، اس کا مقام عبدیت ہے، اسے چارونا چار سر اطاعت خم کرنا ہے۔ اس کیلئے تسلیم ورضا کے بغیر کوئی راہ نہیں ہے۔

جانکنی کے عالم میں ایک اور ہدایت کا علم ہمیں حضرت معقل ابن یسارؓ کی روایت سے ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

''تم اپنے مرنے والوں پر سورۃ یٰسین پڑھا کرو۔'' (مسند احمد، سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ)

یہاں مرنے والے سے مراد وہ ہیں جن پر موت کے آثار ظاہر ہو گئے ہوں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس حکم کی خاص حکمت اور مصلحت کیا ہے، البتہ اتنی بات ظاہر ہے کہ یہ سورۃ دین و ایمان سے متعلق بڑے اہم مضامین پر مشتمل ہے اور موت کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے اس میں اس کا بڑا موثر اور تفصیلی بیان ہے اور خاص طور پر اس کی آخری آیت

(پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ساری کائنات کی حکمرانی ہے اور تمہیں اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے)

موت کے وقت کیلئے بہت ہی موزوں اور مناسب ہے۔

موت کے بعد لواحقین کا طرزِ عمل

اس جہانِ فانی سے رخصت کا مرحلہ ایک اہم مرحلہ ہے۔ یہ وہ ساعت ہے کہ جب رخصت ہونے والے کے لئے مہلت عمل ختم ہو گئی۔ رخصت کرنے والوں کیلئے بھی کڑی آزمائش کا مرحلہ ہے۔ ان کی پسندیدہ چیزوں میں سے ایک چیز ان سے دور کر لی گئی۔ ایک عزیز ہستی کی جدائی سے ان کا دل غمناک ہے۔ لیکن انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ اس نازک ترین ساعت میں بھی وہ ہوش وحواس قائم رکھیں اور غم میں کفران نعمت کے مرتکب نہ ہوں۔

ایسے موقع پر اسوہ حسنہ کی اطلاع ہمیں حضرت انسؓ پہنچاتے ہیں:

''رسول اکرمؐ اپنے بیٹے ابراہیم کے پاس تشریف لائے جب وہ موت کی آغوش میں تھے۔ رسول اکرمؐ کی مبارک آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ (یہ دیکھ کر) حضرت عبدالرحمٰن بن ابن عوفؓ نے آپ سے کہا ''یا رسول اللہ ﷺ! آپ بھی رو رہے ہیں؟'' آپؐ نے فرمایا'' اے ابن عوفؓ! یہ اللہ کی رحمت ہے۔'' پھر رونا شروع کر دیا اور فرمایا'' آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں اور دل غمگین ہے اور ہم صرف وہی کلمات کہتے ہیں جن کو ہمارا رب پسند فرماتا ہے اور اے ابراہیم! ہم تیری جدائی سے غمگین ہیں۔'' (صحیح بخاری ومسلم)

ایک اور مقام پر اپنے عزیز ترین ساتھی حضرت سعد بن عبادہؓ کو سخت تکلیف میں دیکھ کر آپؐ رو پڑے۔ جب صحابہ اکرامؓ نے رسول اکرمؐ کو روتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے بھی رونا شروع کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا'' کیا تم سنتے نہیں ہو کہ اللہ پاک آنسو بہانے اور دل کے غمناک ہونے پر عذاب میں گرفتار نہیں فرماتے؟ لیکن (زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) اس کی وجہ سے عذاب دے گا یا رحم فرمائے گا۔'' (بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ بخاری ومسلم)

اپنے ایک صحابی کو ایسے ہی ایک نازک موقع پر جب کہ ان کا

بچہ حالت نزع میں تھا ان الفاظ میں نصیحت فرمائی:

''اللہ ہی کے لئے ہے جو اس نے لیا اور اسی کے لئے ہے جو اس نے دیا اور ہر چیز اس کے نزدیک وقت مقررہ کے ساتھ ہے پس صبر کرنا چاہئے اور ثواب حاصل کرنا چاہئے۔'' (بخاری و مسلم)

حضرت ام سلمہؓ ایسے مواقع پر اسوہ حسنہ کی مزید تفصیل ہم تک پہنچاتی ہیں۔ یہ تفصیل اس موقع کی ہے جب خود انہیں اپنے رفیق حیات کی جدائی کے اندوہناک حادثہ سے دو چار ہونا پڑا اس موقع پر نبی کریمؐ کی ہدایات اور خود حضرت ام سلمہؓ کا طرزِ عمل نشان راہ ہے۔ اس کی تفصیل حضرت ام سلمہؓ یوں بیان فرماتی ہیں:

رسول اللہؐ ابو سلمہؓ کے پاس تشریف لائے جب کہ ان کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ آپؐ نے ان کو بند کرتے ہوئے فرمایا ''جب روح قبض کی جاتی ہے تو آنکھیں اس کا پیچھا کرتی ہیں۔'' ابو سلمہؓ کے گھر والے رونے اور چلانے لگے آپؐ نے فرمایا ''اپنے لئے بھلائی کے علاوہ کوئی دعا نہ کرو اس لئے جو تم کہتے ہو فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔'' پھر فرمایا ''اے اللہ! ابو سلمہؓ کو معاف فرما اور اس کے پیچھے رہنے والوں میں اس کا خلیفہ بنا اور اے رب العالمین! اس کی اور ہماری مغفرت فرما اور اس کی قبر کشادہ فرما اور اس کے لئے اس کی قبر کو منور فرما۔'' (راوہ مسلم)

کسی کی وفات کی اطلاع ملے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنا مسنون ہے۔

☆ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جس نے کسی مصیبت زدہ کی تعزیت کی تو اس کیلئے مصیبت زدہ کا سا ہی اجر ہے۔'' (جامع ترمذی)

☆ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''اللہ کا ارشاد ہے کہ اپنے ایمان والے بندے (بندی) کے کسی پیارے کو جب میں اٹھا لوں، پھر وہ ثواب کی امید میں صبر کرے تو میرے پاس اسکے لئے جنت کے سوا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔'' (صحیح بخاری)

☆ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے روایت ہے کہ جب ان کے والد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی شہادت کی خبر آئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جعفرؓ کے گھر والوں کیلئے کھانا تیار کیا جائے کیوں کہ وہ اس خبر کی وجہ سے ایسے حال میں ہیں کہ کھانے وغیرہ کی طرف توجہ نہیں کر سکیں گے۔ (ترمذی)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی گھر میں کوئی میت ہو جائے تو قریبی لوگوں کا فرض ہے کہ ان کے لئے کھانا بھجوائیں۔

☆☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر شاہدہ یوسف[1]

بنت مجتبیٰ مینا کے فکری و شعری محاسن

یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خُم خانہ مے

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رُو برو
شرحِ دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ، مو بمو!
می رود از فراقِ تو خونِ دل از دو دیدہ ام
خانہ بخانہ، در بدر، کوچہ بکوچہ، کو بکو!

شخصی و سوانحی کوائف:

نواب مجتبیٰ علی خان کی صاحبزادی بنتِ مجتبیٰ مینا نے بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو برعظیم پاک و ہند کی آزادی کی راہ میں بیش قیمت قربانیاں دے رہا تھا۔ علم و ادب، سیاسی بیداری اور مذہبی اقدار سے وابستگی اس گھرانے کا طرۂ امتیاز تھی۔ تاریخ کے رواں دھارے میں بنتِ مجتبیٰ مینا کے دادا شفیع علی خان اور چچا نواب سخاوت علی خان کے اجتہادات اور مساعی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کا تعلق اس متمول اور صاحب حیثیت خاندان سے تھا جس کے افراد استعماری طاقتوں کے سامنے سینہ سپر اور شمشیر بکف تھے۔ انھوں نے اپنے مزاحمتی رویے سے لادینیت کے سیل بے پایاں کے سامنے بندھ باندھ دیے۔ ان کے آباؤ اجداد تحریک آزادی کے اس ہراول دستے میں شامل تھے جو شیخ احمد سرہندیؒ کے بے باک اجتہادات سے مستفید تھا، جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے افکارِ جلیلہ سے فیض یاب تھا، جس کے کانوں میں مدوجزر اسلام کی گونج ایک ولولۂ تازہ پیدا کرتی تھی اور جس کے تھکے ہوئے اعصاب کو اقبال کی حیات انگیز شاعری بیدار کیے ہوئے تھی۔

بنت مجتبیٰ مینا تاریخ و سیاست کی بیداری کے اس اہم مرحلے پر اپنے اکابرین کے زیرسایہ سیاست و مذہب کی اصالت و جزالت کے گہرے نقوش اپنے قلب و جاں پر اتار رہی تھیں۔ ان کی ذہنی و فکری رہنمائی کے عہد ساز سرچشمے سید سلیمان ندوی، مولانا شبلی نعمانی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا محمد علی جوہر اور سید ابوالحسن علی ندوی جیسی ہستیوں کے فیضانِ فکر کی آب و تاب لیے ہوئے ہیں۔

بنت مجتبیٰ مینا ۱۹۵۲ء میں جب پاکستان آئیں تو ان کی والدہ، ان کے بھائی اور ان کے اکابرین کے ساتھ احیائے امت مسلمہ کے خواب بھی اس قافلے کے ہمراہ تھے۔ تہذیبی اقدار کی پاسداری اور مذہبی شعور نے انھیں پاکستان کی سرزمین پر بھی فکری اور قلمی جہاد کے لیے آمادۂ پیکار رکھا۔

بنت مجتبیٰ مینا نے زندگی کی غایات کو احیائے اسلام کے منشور سے وابستہ کر لیا۔ انھوں نے آمریت اور جبر کے طوفانوں میں مشعل حق جلانے کی سعی بلیغ کی۔ انتشار و اختلال اور زوال وزیاں کو تنظیم و ارتقاع کے اصول سمجھائے۔

انھوں نے عصر حاضر کے بے برگ و بار موسموں کو اسلام کی تخلیقی توانائیوں سے سرشار کیا۔

ان کے شریکِ حیات جناب عبدالسلام خان اور ان کی ہونہار صاحبزادی زہرا نہالہ جو فیصل آباد کے مایہ ناز پلاسٹک سرجن ڈاکٹر عاصم کی شریکِ حیات ہیں، تحریکِ اقامت دین میں ان کے حوصلوں کو بڑھاتے رہے اور وہ اپنے زبان و قلم سے امت مسلمہ کی اخلاقی، معاشرتی اور تہذیبی تربیت کرتی رہیں۔ یہ تربیت کبھی 'حریم ادب' کی مجالس کی وساطت سے ہوئی، کبھی خواتین کے علمی و ادبی جریدے

''چمن بتول'' کے فکر انگیز مقالات اور دلکشا منظومات سے ہوئی اور کبھی بچوں کے ماہنامہ ''نور'' کے ذریعے اپنے اخلاصِ فکر اور استعداد تخلیق کو قوم کے معماروں کی تہذیب نفس اور اصلاحِ احوال کے لیے بروئے کار لایا گیا۔

انھوں نے کم وبیش ۳۵ سال ماہنامہ ''نور'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔

انھوں نے تہذیب اسلامی کے حسن و جمال کو اپنی دلکشا تحریروں میں محفوظ کیا۔ انھوں نے جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے اقامت دین کے فیضان کو نظم ونثر کے حیات انگیز موثرات سے بہرہ یاب کیا اور غیر معمولی معاشرتی بصیرت سے اپنے اخلاقی اور اصلاحی مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

بنتِ مجتبیٰ میناؔ کی نعت گوئی

حضورؐ والا صفات کی ازلی و ابدی رہبری کا اعتراف اور ان کے منشورِ حیات کے فیضان کو عام کرنا ہر مسلمان کے جذبہ واحساس کی پہلی اور آخری منزل ہے، اس لیے کہ اسلامی تہذیب کے سارے آب ورنگ، ایمان وایقان کی ساری گہرائیاں، حریت فکر کے سارے چراغ اُسی روشنی کی عطا ہیں جسے قرآن مجید میں ''سراجِ منیر'' کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

عشق رسولؐ کی تپش وحرارت اور اتباع خیر الانام کی خواہش کا یہ جذبہ بنتِ مجتبیٰ میناؔ کی نعتوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

اک آرزوئے دلِ نا مراد اتنی ہے
حضورؐ آپ کی چوکھٹ پہ دم نکل جائے
میں راہِ عشق میں یوں جان سے گزر جاؤں
کہ میری خاک تری خاکِ پا سے مل جائے

صنف نعت کے فیضان نے ان کے باطن اور ان کی روح کو منور کر رکھا تھا۔ سعدی شیرازی، فرید الدین عطار، مولانا جامی اور حافظ رومی کے گہرے مطالعے نے ان کے شعورِ نعت کی جلا کی۔

ان کا ایک نعتیہ قطعہ ملاحظہ کیجیے:

ذکرِ حضورؐ پاک پہ قربان جایئے
ٹکڑے ہزار دل کے حضوری میں لایئے
پلکوں کا فرش راہ گزر میں بچھایئے
دل کے لہو سے شمعِ محبت جلایئے

ان کے دل میں عشقِ رسول اور نعت گوئی کا شوق رگ ابر میں برق کی بے قراری کی طرح چھپا ہوا ہے۔ ان کے سر میں عشق رسولؐ کا سودا ہے اور دل میں ان کی عنایات اور شفاعت کی تمنا!

نعت کے آئینے میں ان کے سوز وکرب کی جھلکیاں اور ان کی والہانہ شیفتگی کے مظاہر دیکھیے:

یہ جی میں ہے کسی صورت تمھارے در پہ جا پہنچوں
وہی دیوار و در دیکھوں مدینے کی زمیں چوموں
تمہی سے حالِ دل اپنا کہوں آہستہ آہستہ
انہی گلیوں میں سرگشتہ سحر سے شام تک گھوموں

انھوں نے نعت نگاری کے ایوانوں میں اپنے ایمان وایقان کی شمعیں جلائیں اور روحانی، اخلاقی اور تمدنی زوال کے حوصلہ شکن مراحل میں نعتِ نبیؐ اور سیرتِ اطہر کو اپنا منشورِ حیات بنایا۔

قطعہ نگاری

بنتِ مجتبیٰ میناؔ نے اپنے جذبہ واحساس کی مے کو قطعے کی صنف میں بھی بڑے موثر پیرائے میں انڈیلا ہے۔

صنفِ قطعہ میں فکر وخیال کے ایک سلسلے کی جامع تکمیل کے لیے دو یا دو سے زیادہ اشعار میں مافی الضمیر بیان کیا جاتا ہے۔ بنت مجتبیٰ میناؔ نے قطعے کی صنف میں اپنے احساس وادراک کے ان مٹ نقوش اجاگر کیے ہیں۔ ان کے قطعات میں حروف والفاظ کی مقدس صداقتیں مشعلوں کی طرح جگمگا رہی ہیں۔ قطعات کی محمل میں ان کی نرم اور دل نشیں آرزوئیں کسی لیلیٰ کی طرح اپنے جلوؤں کی آن بان

اور چھب دکھا رہی ہیں، ملاحظہ کیجیے:

اے دل کے آبگینے چاہا بہت بچانا
کیا کیجیے کہ تیری قسمت ہے ٹوٹ جانا
وہ دورِ جام آخر دل کیسے بھول جائے
ساغر اٹھا کے یارب ساقی کا روٹھ جانا

ان کے ایک اور قطعے میں ان کی تخلیقی توانائیوں اور جمالیاتی اظہار کی جھلک ملاحظہ کیجیے:

نیم خوابیدہ کنول جیسے کسی تالاب میں
نکھری نکھری چاندنی میں سورہی ہے کائنات
چپکے چپکے لٹ رہا ہے کاروانِ زندگی
قطرہ قطرہ رِس رہی ہے آہ صہبائے حیات

غزل گوئی

اردو شاعری میں غزل کی مستحکم وتوانا روایت چار صدیوں سے زیادہ عرصے پر پھیلی ہوئی ہے۔

اختصار واجمال اور رمز وایما کی حامل یہ صنفِ سخن شاہوں اور گداؤں میں یکساں مقبول رہی۔صوفیائے کرام نے اسے رشد وہدایت اور وارداتِ قلب کے لیے استعمال کیا، بادشاہوں اور کج کلاہوں کے ایوانوں میں بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اہل دل نے اسے حسینانِ پردہ نشیں کےحسن و جمال کے اوصاف بیان کرنے کے لیے استعمال کیا۔

بنت مجتبیٰ مینا نے قدیم کلاسیکی روایات اور جدید احساسات کی حامل صنفِ غزل کواس کی پوری رمزیت وایمائیت اورخوش سلیقگی سے اپنے جذبہ واحساس کا ترجمان بنایا۔

ان کی غزل میں سرد وگرم موسموں کے دکھ،نہاں خانۂ دل کے قیمتی راز، آرائشِ خم کاکل اور اندیشہ ہائے دور ودراز سب کچھ موجود ہے۔ملاحظہ کیجیے:

دل ہے اک تنہا مسافر تنگنائے عشق میں
ہائے اس تنہا سے اس کا دردِ تنہائی نہ پوچھ
کیا کہیں خارِ مغیلاں کیا کہے دشتِ جنوں
خستہ جان و خستہ دل کی آبلہ پائی نہ پوچھ

ان کی غزلوں میں رنج والم کی کرب انگیز اور حقیقی محسوسات و روحانی تجربات کی آن بان بھی ہے،نسائی جذبات کی حامل خودسپردگی بھی ہے اور جذباتِ عشق کی تپش وحرارت بھی، عجز وفتادگی بھی ہے اور خودگری اور خودنگری بھی!

ملاحظہ کیجیے:

پھر وہی میں ہوں وہی بادیہ پیمائی ہے
دیدۂ دشتِ بلا تو بھی تماشائی ہے!
تُو تو غیروں کو سدا چاہنے والا ٹھہرا
تیری محفل میں کہاں میری پذیرائی ہے
کتنا جانکاہ تھا یہ مجھ سے تعلق کا مذاق
دل لگی ان کی تھی یاں جان پہ بن آئی ہے

ان کی غزل میں ایک کرب مسلسل ہے جوان کے احساسِ تنہائی دل شکستگی اور دردمندی کا آئینہ دار ہے۔ان کی غزلوں میں دوشیزگی کے نرم و نازک احساسات کی ترجمانی اور یاسیت کے ہلکے گہرے رنگوں کی میٹھی میٹھی کسک بھی،عنفوان شباب کے دل آویز خوابوں کی قوسِ قزح بھی ہے اور حقیقت افروز رومانیت کے گہرے رنگ بھی، شکست شب کی کیفیتیں بھی ہیں اور پیکارسحر کے نغمات بھی!

ملاحظہ کیجیے:

زندگی عشقِ فسوں گر کا اشارہ بن کر
رگِ ہر سنگ میں رقصاں ہے شرارہ بن کر
خامیِ ذوقِ طلب بڑھ کے ڈرا دیتی ہے
ورنہ ہر موج اُٹھے رنگ کنارا بن کر
کس کا ٹوٹا ہوا دل تھا جو ذرا دم لینے
آن ٹھہرا تیری پلکوں پہ ستارا بن کر

کبھی جو بادِ بہاری ترا گزر ہوتا

ہمارا نخلِ تمنا بھی بار ور ہوتا

ان کی غزل میں عشق ومحبت، حسن و جمال اور نشاط واستعجاب کے بڑے دل پذیر اور گہرے رنگ ہیں۔ ان کی غزلیات میں رنج مہجوری کی تاب وتب بھی ہے اور جذبۂ عشق کی حرارت بھی، جذباتی و ہیجانی کیفیات کا تلاطم بھی ہے۔ غموں کی تیرگی بھی اور آرزوؤں کی روشنی بھی، اضطراب کی آنچ میں جلتے ہوئے لمحوں کا دکھ بھی ہے اور لمحاتِ حضوری کی طمانیت وآسودگی بھی! ان کی مذکورہ غزل میں ان تمام کیفیات کی آن بان دیکھیے:

وہ سمجھ لیتی ہے جو طبع رسا ہوتی ہے
جب خودی ہو دلِ مومن میں تو کیا ہوتی ہے
وادیٔ عشق کا دستور یہی ہے کہ یہاں
تختۂ دار پہ تکمیلِ وفا ہوتی ہے
کیا ستم ہے کہ تری بزم میں اے حسنِ تمام
ترے ہی چاہنے والوں پہ جفا ہوتی ہے
کوئی نغمہ اُسے سمجھے تو کوئی نالۂ مے
قلقلِ مِینا بھی کیا طرفہ صدا ہوتی ہے

نظم گوئی

بیسویں صدی کے آغاز میں ہی جدید اردو نظم مشرقی کلاسیکی روایت کے ساتھ ساتھ انگریزی اور ہندی روایات سے بھی مالا مال ہو چکی تھی۔ نظم کے نئے امکانات کی دریافت حالی، اقبال، مولانا ظفر علی خان، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری جیسے اکابرین کے ہاتھوں ہوئی۔ ان اکابرین نے آنے والے نظم گو شعرا کو ماضی سے ربط رکھ کر مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت عطا کی۔

بنتِ مجتبیٰ مینا کی نظم ذاتی، سماجی اور معاشرتی المیوں کے احساس سے مالا مال ہے۔ ان کی نظمیں تاریکیوں میں روشنی اور جبر میں اختیار و اعتبار کا پیغام دیتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ان کی دل نواز شخصیت اور ان کی گل افشانیٔ گفتار کے جوہر خوب کھلتے ہیں۔ ان کے نرم وشیریں لہجے میں کبھی حزن وملال کا رنگ گہرا ہو جاتا ہے۔ گزرے ہوئے دنوں کی پرچھائیاں ایک دل پذیر احساس بن کر ان کی نظم کی اثر انگیزی کو بڑھا دیتی ہیں۔

اُن کی نظم ''میں اکثر سوچا کرتی ہوں'' میں ناسٹلجیائی کیفیات اور ایک حزنیہ لے شروع سے آخر تک رہتی ہے۔ مذہب وتہذیب اگرچہ اُن کی شاعرانہ فکر کا محور ہیں تاہم ان کی منظومات میں اُن کے بطونِ ذات کی بہت سی وارداتوں کا بھی بڑا موثر اظہار ہے۔ اُن کے جذبہ واحساس کی ذاتی اقلیم کے طلسمات پوری آن بان سے اُن کی شاعری میں جلوہ گر ہیں۔ ماضی کے سحر کدوں میں مراجعت اور یادوں کی راکھ سے چنگاریوں کو ڈھونڈنے کی خواہش اُن کی بہت سی نظموں کو سوز وساز اور گہرے رنج والم کا حامل بنا دیتی ہے۔ بریلی میں گزرے ہوئے مہ وسال، بہن بھائیوں کی رفاقتیں، بریلی کی طویل وعریض حویلی میں سرسبز وشاداب باغ، بیلوں کی بجتی ہوئی گھنٹیاں، ماضی کے خواب دکھاتی ہوئی پھاگن کی ہوائیں، جاڑوں کی جاتی ہوئی رتوں میں پھیلتے ہوئے سوچ کے دائرے ان کی یاد کے اُفق پر سوچ کے دائروں کو گہرا کر دیتے ہیں۔

اُن کی نظموں کا ایک اور اہم پہلو مناظر فطرت سے اُن کی والہانہ شیفتگی اور وابستگی ہے۔ اس قبیل کی نظموں میں ''مستونگ میں ...... تیرے بغیر'' اُن کی فطرت پسندی اور رومان پروری کی بہت خوبصورت مثال ہے:

نکہتوں کا اک طرف کلیوں کے ہونٹوں پر ہجوم
مچ رہی ہے اک طرف برسات آجانے کی دھوم
ساقیٔ فطرت کا کہنا ہے کہ پیمانے کو چوم
آہ یہ دل کب ہوا محوِ تماشائے بہار

اُن کی نظم ''نخلِ حسیں'' اور ''کنارِ آبِ جو'' مناظرِ فطرت سے اُن کے قلبی انہماک وارتباط کی آئینہ دار ہیں۔ ''نخلِ حسیں'' دشتِ تمنا میں نشوونما پانے والے کھجور کے درخت سے اُن کی گہری وابستگی کو ظاہر کرتی ہے۔ جبکہ اُن کی نظم ''کنارِ آبِ جو'' اور صوبہ بہار میں ''ایک

شام'' بھی اُن کی منظر پرستی اور فطرت پسندی کی دلیل ہیں۔ ''کنارِ آب جو'' میں بل کھاتی ہوئی نہر، جھومتے ہوئے کھیتوں اور سرسوں کے زرد پھولوں کا طلسم جادو بکھیرتا نظر آتا ہے۔ شام کے چراغ اور ستاروں کی تمثالیں اور فطرت کا حسن بے حجاب اُن پر حیرت واستعجاب کے در کھول دیتا ہے۔

اُن کی نظموں کا تیسرا واضح رجحان اُن کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی موضوعات کی حامل نظمیں ہیں۔

ان منظومات میں، غازیانِ تازہ دم، پہلی کرن، مکتب عشق و محبت کا یہ دستور نہیں، یادِ وطن اے بیگمات اپوا، عید قربان کا چاند دیکھ کر، اک آواز، میں عورت ہوں اور تشویش ان کی گہری سماجی وسیاسی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں اور شعورِ مذہب کے فقدان سے جنم لینے والے اخلاقی المیوں پر بنتِ مجتبیٰ مینا کا کرب اور رنج والم انھیں پیہم مضطرب اور بے چین رکھتا ہے۔ خارزارِ حقیقت کی ان تلخیوں اور سنگینیوں کے باوجود اُن کے جذبہ واحساس کی رومان پسندی اُن کے ذہن ودل کی نرم وشیریں کیفیات اور دور دور تک پھیلے ہوئے ماضی کے نرم اور سہانے خواب حقیقتوں کی کڑی دھوپ میں بھی اُن کے ہم رکاب رہتے ہیں، ذاتی اور اجتماعی کرب کے جاں شکن مراحل میں بھی آرزوؤں کے دلکشا مناظر کی روشنی اُن کے قلب وجاں کو مستنیر ومنور کیے رکھتی ہے۔

سیاسی، سماجی اور دینی کج روی کے خلاف اُن کی شاعری نے جو مزاحمتی کردار ادا کیا اُسے اہل قلب ونظر ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

اس قبیل کی منظومات میں ان کی ایک نظم ''اب نہیں تابِ سفر'' ندرت اظہار اور حسنِ بیان کا کرشمہ ہے۔ نظم کا پہلا حصہ یاس وحرمان اور شکست خوردگی کی کیفیات کا آئینہ دار ہے جبکہ نظم کا دوسرا حصہ ''کیوں نہیں تابِ سفر'' حوصلہ مندی اور اولوالعزمی، پامردی اور استقامت کا اعلان ہے۔ یاس وناامیدی اور ہمت وبلند حوصلگی کے درمیان یہ مکالمہ علامہ اقبال کی مشہور زمانہ منظومات ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کی یاد دلاتا ہے۔

احیائے ملتِ اسلامیہ کے خواب اُن کی شاعرانہ فکر کا مستقل حصہ تھے اُن کے جمالیاتی اظہار وبیان کی سب سے بڑی سچائی مذہبی اقدار کی بازیافت تھی۔ بنت مجتبیٰ مینا نے انسانی تہذیب کے بے برگ وبار موسموں کو اپنی شاعرانہ مساعی سے سیراب وسرشار کیا۔

اُس حسن پاکباز کی آتی رہے گی یاد
نورِ سحر کے ساتھ کبھی چاندنی کے ساتھ

❁❁❁

۱

اب نہیں تابِ سفر

اب کہاں غم سے مفر
اب نہ آئے گی سحر
کس لیے اٹھے نظر
اب نہیں تابِ سفر

اب اجڑ جائے یہ باغ
جس میں جلتے ہیں چراغ
یادِ ایام کے داغ
اب نہیں تابِ سفر

دل پہ اب ناز نہیں
سوز ہے ساز نہیں
کوئی آواز نہیں
اب نہیں تابِ سفر

کوئی تارا بھی نہیں
ایک شرارا بھی نہیں
جھوٹا سہارا بھی نہیں
اب نہیں تابِ سفر

۲

کیوں نہیں تابِ سفر

رحمتِ حق بن کر
کیوں نہیں اٹھتی نظر
کیوں نہیں تابِ سفر
رات کٹتی ہے ابھی

عشق کے ماروں کی
ہم گنہگاروں کی
تیرے بیماروں کی
بات بنتی ہے ابھی

اے دلِ زار ٹھہر
اک ذرا صبر تو کر
وہ رہا نجمِ سحر
شب گزرتی ہے ابھی

پاؤں معذور سہی
منزلیں دور سہی
لاکھ مجبور سہی
آس باقی ہے ابھی
کیوں نہیں تابِ سفر؟

بنت مجتبیٰ مینا

کیوں؟

جب یاد آئے تو سمجھانا
آنسو آئیں تو پی جانا
جب دل گھبرائے چپ رہنا
کچھ کہنا ہو تو، مت کہنا!
اس بستی میں کیوں صدیوں سے
دستور یہی ہے جینے کا

ہر پھول یہاں مرجھاتا ہے
ہر اک پتا گر جاتا ہے
کہساروں کا ستھرا پانی
اشکوں کی طرح بہہ جاتا ہے
اس بستی میں کیوں صدیوں سے
دستور یہی ہے جینے کا

ہر صبح کلی کے ہاتھوں سے
شبنم کا دیا گر جاتا ہے
دھیرے سے کلی مسکاتی ہے
اک پھول نیا کھل جاتا ہے
اس بستی میں کیوں صدیوں سے
دستور یہی ہے جینے کا

ہر شب جو خواب دکھاتا ہے
ہر صبح کو جوت جگاتا ہے
وہ کون ہے کیا سمجھاتا ہے
کیوں اپنا آپ چھپاتا ہے
اس بستی میں کیوں صدیوں سے
دستور یہی ہے جینے کا

بنت مجتبیٰ مینا

غزل

کیسے غمِ حیات کے بندھن کو توڑ دے
اب جیتے جی کسی کو کوئی کیسے چھوڑ دے

اس خامشی کو جان کے اقرارِ دوستی
وحشت کوئی تعلقِ خاطر نہ جوڑ دے

کب آدمی کے خواب نگل جائے بے بسی
کب خواہشوں کی لاش کنارے پہ چھوڑ دے

کب سر جھکا دے وقت کی دہلیز پر حیات
کب سامنے کسی کے خودی ہاتھ جوڑ دے

کب ہنستے ہنستے آنکھ سے آنسو ابل پڑیں
کب سیلِ درد ضبط کے پشتوں کو توڑ دے

کب ڈال دے اندھیروں کے تاریک دشت میں
بینائی کس مقام پہ آنکھوں کو چھوڑ دے

ناموس پر کسی کی کوئی یوں جھپٹ پڑے
انسانیت کو آدمی ایسے بھنبھوڑ دے

شاید یہی ملال خوشی کا سبب بنے
شاید یہ بے کلی ہمیں مولا سے جوڑ دے

شمیم فاطمہ

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

زیب النساء

یہ کہانیاں زندگی کے سچے واقعات پر مبنی ہیں جن میں ہم اپنے معاشرے کا اصل چہرہ دیکھ سکتے ہیں اور بہت ساری خرابیوں کا علاج کر سکتے ہیں

کلینک کا ٹائم دو بجے تک ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر زوبیہ کو اکثر چار بلکہ پانچ ہی بج جاتے۔ ایک تو جس علاقے میں ان کا کلینک تھا وہاں دور دور تک کسی لیڈی ڈاکٹر کا ملنا محال تھا دوسرا گائنی کے سارے کیس دور دراز علاقوں سے ان کے پاس آتے تھے اس طرح دوپہر کے کھانے پر ان کے بچے اور شوہر انتظار کرتے رہتے لیکن اس کا کوئی حل نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ طے کر لیا کہ رات کا کھانا سب اکٹھے کھایا کریں گے۔

ان کے شوہر ڈاکٹر زرغم کی تجویز تھی کہ وہ دن کو گھر رہیں اور شام کو کلینک میں بیٹھیں لیکن نزدیکی قصبوں اور دیہاتوں سے جو لوگ آتے ان کیلئے شام کو آنا مشکل تھا۔ دونوں میاں بیوی کی اپنی اپنی مصروفیات اندازے حوصلے اور فیصلے تھے۔

یہ 4 اکتوبر بدھ کا دن تھا جب نرس نے آکر بتایا کہ ایک اماں جی آئی ہیں کہتی ہیں تم سو روپے کی بجائے دو سو روپے فیس لے لو لیکن مجھے ڈبل ٹائم چاہئے۔ میرا مسئلہ ہے کوئی...... نرس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

زوبیہ نے مسکرا کے دیکھا ''تو تمہیں دو سو روپے لینے میں کیا اعتراض ہے''۔

''بھلا لوگ تو سو روپے پر بھی لڑتے ہیں کہ فیس زیادہ ہے اور یہ! مریض اتنے زیادہ ہیں آپ پورا ایک گھنٹہ کیسے دینگی''

''چلو تجربہ ہی سہی شائد کوئی کہانی ہاتھ آجائے۔ تم ان کو آخر میں بھیجنا۔''

وہ اچھا کہہ کر چلی گئی اور زوبیہ کے لاشعور میں ایک بند کھڑکی کھل گئی۔ یہ کون ہے کیا مسئلہ ہوسکتا ہے! آخر کار اس کی باری آگئی۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام!'' ڈاکٹر زوبیہ نے داخل ہونے والی خاتون کو دیکھا اور پہچان لیا۔ یہ ان کی پرانی مریضہ تھیں۔

''زیب النساء کیا حال ہے آپ کا، بڑے دنوں بعد تشریف لائی ہیں؟''

''جی ڈاکٹر صاحبہ بس اس بڑھاپے میں سستی نے آ پکڑا ہے۔ روز سوچتی ہوں بس کبھی گاڑی اور ڈرائیور نہیں ہوتا کبھی دیر ہو جاتی ہے۔ آج نکل آئی''۔

''بلڈ پریشر تقریباً ٹھیک ہے۔ دوائی تو آپ لے رہی ہیں۔ ذرا پچھلی پرچیاں تو دکھائیں''۔

''وہ تو مجھ سے گم ہوگئی ہیں۔ دوائی کی شیشی ساتھ لے آئی ہوں یہ دیکھ لیں۔ دراصل سارے گھر میں چونا کروایا تھا تو کمرے کا سامان ادھر ادھر ہوگیا۔'' زیب النساء نے صفائی پیش کی۔

''یہ ایک گولی صبح شام لے رہی ہیں؟'' زوبیہ نے پوچھا

''جی! جب بلڈ پریشر زیادہ ہو تو مجھے پتہ چل جاتا ہے۔ یہ پوچھنا تھا کہ اگر زیادہ ہو تو کیا تیسری گولی لے لیا کروں''۔ اس کا سانس اب بھی پھول رہا تھا۔

''اس طرح تو مناسب نہیں ہے۔ آپ الیکٹرانک آلہ بی پی دیکھنے والا خرید لیں میں آپ کو دیکھنا سکھا دوں گی۔ ماشاء اللہ آپ پڑھی لکھی ہیں''۔

''بہت بہت شکریہ۔ یہ تو آپ نے اچھی بات بتائی کوئی مصروفیت

نکل آئی''۔زیب نے بڑی حسرت سے کہا۔

''زوبیہ نے دوائی لکھتے ہوئے پوچھا، اور تو کوئی پرابلم نہیں ہے؟ آپ اپنا سارا ریکارڈ نہیں لائیں۔ بلڈ ٹیسٹ اور ای سی جی ضروری ہے''۔

''جی اچھا'' پھر ٹھہر کر بولی۔''مگر آج تو میں نے آپ سے باتیں کرنے کیلئے وقت مانگا ہے۔میرا دل چاہتا ہے تنہائی میں مرنے سے پہلے کسی کے سامنے دل کھول کر رکھ دوں۔اپنوں کے پاس تو وقت نہیں ہے۔میاں صاحب تو مجھے چھوڑ کر پہلے اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے۔اولاد دن رات دو کو چار کرنے میں مصروف رہتی ہے۔کسی کے پاس فرصت نہیں ہے''۔

ساتھ ہی آنکھیں اشکبار، ضبط کے بندھن تار تار، لہجہ درد سے بیقرار، زخم دل کھلنے کو تیار، جیسے انہیں اسی لمحے کا انتظار تھا۔ پہلے ہچکیاں، پھر وہ سسکیوں میں تبدیل ہوگئیں۔نہ جانے کب سے یہ جام لبریز ہوکر چھلکنے والا تھا۔

زوبیہ پریشان ہوگئی۔اس نے بیل بجائی۔نرس اندر آئی۔''جی میڈم۔''''ایک گلاس پانی لاؤ، اس کے بعد اچھی سی چائے اور بسکٹ لانا۔کسی کو اندر نہ آنے دینا''

''بہت اچھا جی''''زیب پانی پیو، حوصلہ کرو، مجھے بتاؤ کیا بات ہے دیکھو میں نے قلم رکھ دیا ہے۔ میں فارغ ہوں تسلی سے بات کرو''بہت تھوڑی سی توجہ دلجوئی اور تسلی پا کر آنسو بند توڑ کے نکلے۔

پلکوں کے بند توڑ کے دامن پہ آ گرا
اک اشک میرے ضبط کی توہین کر گیا

زوبیہ نے اسے رونے دیا۔ایک منٹ کے بعد اس نے کہا''لو یہ پانی پی لو آنسو غم کا علاج نہیں ہیں۔پلیز مجھ پر بھروسہ کرو مجھ سے اپنا دکھ شیئر کرو۔''

''سچ بات یہ ہے کہ میں نے آج تک زبان نہیں کھولی، گلہ شکوہ تو دور کی بات ہے۔مگر اب میری بس ہوگئی ہے کیا کروں کہاں جاؤں۔ میں اپنے ہی گھر میں اجنبی ہوں۔بات کرنے کو ترس گئی ہوں''۔

زوبیہ نے اسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا بولنے دیا۔

''بھرا گھر ہے میرے نو بچے ہیں۔سارے ہی شادی شدہ اور اپنی زندگیوں میں خوش اور مگن ہیں اتنے مزے میں ہیں کہ انہیں ماں کی اداسی، تنہائی، بیماری، کمزوری، ناطاقتی کا دھیان ہی نہیں آتا۔ یہ وہی بچے ہیں جن کی ایک آواز پہ میں رات کو اٹھ جایا کرتی تھی۔ بچہ بیمار ہوتا تھا تو میاں صاحب کہتے تھے تم دوسرے کمرے میں اسے لے کر چلی جاؤ میری نیند خراب ہوتی ہے۔ میں نے صبح عدالت جانا ہے۔ جب وہ بیمار ہوئے تو میں نے دن رات ان کی خدمت کی ان کو کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔گلہ تو وہ بھی کرتے تھے کہ بیٹے کھڑے کھڑے حال پوچھ کر چلے جاتے ہیں۔میرے پاس نہیں بیٹھتے تو میں ان کو تسلی دیتی تھی کہ وہ اپنے کام کاج میں مصروف ہیں۔اچھی بات ہے میں ہوں نا آپ کے پاس۔وہ بے بسی سے میری طرف دیکھ کر رو پڑتے تھے۔لیکن میں......''

اس کی آواز دوبارہ رندھ گئی۔وہ اپنی گفتگو جاری نہ رکھ سکی۔

زوبیہ پریشان سی ہوگئی۔ اسے ڈاکٹر بنے بارہ سال ہو گئے تھے۔ سرکاری ہسپتال میں کام کرتے ہوئے کتنے ہی مریضوں سے پالا پڑا لیکن کبھی کسی کو انفرادی طور پر انسان سمجھ کر بات نہیں کی۔بس سرسری طور پر مشینی انداز میں حال پوچھا، تکلیف دریافت کی، دوا لکھی، شانہ تھپتھپایا، رٹے رٹائے الفاظ میں تسلی دی۔فکر کی بات نہیں ہے۔اللہ پاک رحم فرمائیں گے۔چلو شاباش اب تم جاؤ ہفتے بعد آ کر دکھا دینا۔ آرام نہ آیا تو ہسپتال میں داخل کرلونگی۔کانوں میں اس کے اپنے جملے گونج رہے تھے۔وہ شرمندہ ہوگئی کہ کیا اسی کا نام خدمت خلق ہے!! آج زیب النساء نے اس کی آنکھیں کھول دیں زندگی اندر سے کیسی زخمی اور خوفناک ہے یہ کونسی بیماری ہے اور اس کا علاج؟؟ اسے سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ وہ کونسی دوا تجویز کرے۔زیب النساء نے اپنے آنسو صاف کئے اور دوبارہ سلسلہ کلام شروع کیا۔

''میرے تین بیٹے باہر ہیں۔ناروے، جرمنی اور جاپان''۔''تم ان کے پاس چلی جاؤ''اسے امید کی کرن دکھائی دی۔''گئی تھی''اس

نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''بڑوں کے پاس وقت نہیں تھا اور بچوں کو میری بات سمجھ نہیں آتی بہو بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ بیٹا بات کرے تو بہو کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ! شوہر کے بعد عورت کی کیا قدر اور اوقات رہ جاتی ہے۔ میرے رب کو تو یہ علم ہے تو پھر عورت کو پہلے جانا چاہئے''۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ ہم سیدھی راہ سے بھٹک گئے ہیں دنیا کی چکا چوند اور خواہشات نے ہمیں رشتوں کی اہمیت سے غافل کر دیا ہے''۔ اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''دو دن پہلے رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی آپ نے مجھے نیند کی گولیاں دی تھیں وہ ختم ہو گئی ہیں۔ میں نے درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ سر میں درد شروع ہو گیا۔ ساتھ ہی دانت میں بھی۔ میں کچن میں گئی لونگ ڈھونڈا اور دانت کے نیچے رکھا۔ پھر گردن کی پچھلی طرف خارش شروع ہو گئی اس پر کریم لگائی پھر کان کی باری آئی اس میں بادام روغن ڈالا۔ دوبارہ کچن میں گئی کہ ایک پیالی چائے بنا کر پی لوں اور دو گولیاں پیناڈول کھا لوں۔ لیکن ساری ترتیب بدلی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے پتی اور چینی تلاش کی۔ گھڑی دیکھی تو رات کے تین بج رہے تھے۔''

''ملازمہ کوئی نہیں ہے؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا، وہ اس کا تسلسل توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

''جیلو ہے لیکن وہ بھی وی سی آر کے شوق میں میری بہوؤں کا طواف کرتی رہتی ہے۔ اس کا دل ادھر ہی لگتا ہے۔ کبھی لپ اسٹک مل گئی کبھی جوڑا کپڑوں کا، ملک شیک بنایا تو اس کو بھی مل گیا غریب اور محرومیوں کی ماری ہوئی۔ مجھے اس پر بھی ترس آ جاتا ہے۔

پھر باتھ روم کے چکر شروع ہوئے، تین بجے، پھر ساڑھے چار بجے پھر چھ بجے صبح پھر ساڑھے آٹھ......ساری رات کا جگراتا تکلیف، تنہائی۔ صبح صبح جیلو آئی مجھے بستر میں دیکھ کر واپس جا کر کہنے لگی اماں سو رہی ہیں جب جاگیں گی تو ناشتہ بنا دونگی میں سن رہی تھی اٹھنے کی ہمت ہی نہ تھی۔ دس بجے دوبارہ آئی۔ ٹرے میں دو سوکھے ٹوسٹ اور ایک پیالی چائے کی۔ میں نے ایک نظر ڈالی، مجھے خاموش دیکھ کر بولی اور کچھ لا دوں؟ میں چپ رہی۔ دلیہ پکا دوں یا انڈا بنا دوں؟ صائمہ باجی کہتی ہیں اماں جی کو انڈا نہ دینا، وہ بیمار ہیں۔ شبو باجی نے کہا تھا اماں کے سالن میں بوٹی نہ ڈالنا ان کیلئے اچھی نہیں ہے۔

بیٹے اس صبح ملنے اور خدا حافظ کہنے نہیں آئے کہ جیلو نے بتا دیا تھا کہ اماں سو رہی ہیں اور کسی کو خود آ کر دیکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ وہ میری اولاد تو نہیں ہے۔ کسی نے آ کر یہ نہ پوچھا کہ آپ ٹھیک تو ہیں۔ کیسی بے چارگی، بے بسی اور بے قدری ہے لیکن میں وہاں رہنے پر مجبور ہوں۔ ہم نے معاشرے میں خود ہی ایسا سسٹم بنا دیا ہے کہ بیٹی کے پاس جا کر رہنا جرم لگتا ہے۔ بیٹے کہتے ہیں ہماری ناک کٹ جائے گی۔ شریک ہماری باتیں کریں گے۔ اس گھر میں آپ کو کیا تکلیف ہے۔ الگ کمرہ ہے اٹیچ باتھ ہے۔ الگ نوکر ہے۔ کام آپ کو کرنا نہیں پڑتا۔ پکا پکایا کھانا مل جاتا ہے دھلے دھلائے کپڑے مل جاتے ہیں۔ بیمار ہوں تو ڈاکٹر اور دوائی موجود اور آپ کو کیا چاہئے۔ اماں، ابا کے جانے کے بعد آپ زود رنج ہو گئی ہیں۔ جب انسان بیکار ہو تو فالتو سوچیں اسے بیمار کر دیتی ہیں۔ آپ کچن میں چلی جایا کریں سبزی بنا دی، استری کر دی، اس طرح آپ کا دل لگا رہے گا۔ یہ بڑا بیٹا تھا، لیکچر دے کر چلا گیا۔

میں چپ کی چپ رہ گئی، اسے بتا ہی نہ سکی کہ میرے پاؤں ٹانگوں اور ہاتھوں میں کڑل (Cramps) پڑ جاتے ہیں، نماز نہیں پڑھی جاتی، چار قدم چلا نہیں جاتا کیا انسان کی صرف یہی ضرورتیں ہوتی ہیں؟ یہ تو حیوانی زندگی ہے۔ اس کے جذبات احساسات سوچ فکر، خیال، دکھ، غم......مگر ابھی جوانی ہے نا۔ میری بات ان کی سمجھ میں کہاں آئے گی۔ جب ان کی اولاد ان کے ساتھ یہ سلوک کرے گی تو آنکھیں کھلیں گی مگر تب کیا فائدہ ہم تو قید زندگی سے آزاد ہو جائیں گے'۔

زوبیہ نے گھڑی دیکھی اسے آئے ہوئے ایک گھنٹہ اور دس منٹ ہو چکے تھے۔ چائے بنا کر اس نے ایک پیالی اس کی طرف رکھ

دی اور دوسری خود اٹھالی۔ وہ چائے پینے لگی تو اس کے چہرے پر سکون آ گیا۔ ڈاکٹر کا دل مطمئن سا ہو گیا۔ یہ غیبی امداد تھی۔ اب اس نے بولنا شروع کیا۔

''دیکھو زیب النساء! یہ دنیا بہت خوبصورت ہے یہ جس کسی کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے وہ پیچھے مڑ کے دیکھے اس کو یہ فرصت نہیں دیتی۔ سوائے ان لوگوں کے جن پر رب کی رحمت ہو۔ ہم اس میں اتنا ڈوب جاتے ہیں کہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ یہ عارضی ہے، فانی ہے اس کو جلد ہی چھوڑ جانا ہے۔ لیکن آنکھ تب کھلتی ہے جب یہ بند ہونے والی ہوتی ہے۔ آپ کا ایک مسئلہ تنہائی ہے اور دوسرا پیٹ کا خراب رہنا۔ آپ دیکھو کہ آنکھوں میں وہ بینائی نہ رہی جو پہلے تھی، کانوں میں وہ شنوائی نہ رہی، عقل میں وہ دانائی نہ رہی، ہاتھوں میں وہ توانائی نہ رہی، پاؤں میں جادہ پیمائی نہ رہی، چہرے کی وہ زیبائی نہ رہی، قوت برداشت نہ رہی، بالوں میں وہ رعنائی نہ رہی، خیالوں اور سوچوں میں روشنائی نہ رہی، سب چیزیں رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑے جا رہی ہیں تو معدہ اور انتڑیاں بھی پہلے کی طرح مضبوط اور کام کرنے کے لائق نہیں رہیں۔ اس لئے کھانا اور کم کر دو، ہلکی غذا کھاؤ، ہر تین گھنٹے بعد جوس یا کوئی پھل صرف ایک لے لیا کرو۔ یہ تنہائی بھی عارضی ہے۔ یہ بھی نہیں رہے گی فکر نہ کرو۔ زندگی کے خوبصورت ایام اور لمحات کو یاد کیا کرو، بیٹیوں کے گھر چلی جایا کرو سوچو نا ہم نے موت سے لے کر روز حشر تک قبر میں سوتے رہنا ہے وہ بھی تو تنہائی ہوگی۔ اگر ہمارے اعمال اچھے ہوئے تو ٹھیک ورنہ...... وہ انجام سوچ کر بھی ہول آتا ہے۔''

''آپ کی ساری باتیں خوبصورت اور دانائی لئے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ تو کل کی بات ہے اور اس کے کرم کی امید ہے۔'' ''آج'' تکلیف دے رہا ہے اس کا کیا علاج ہو؟

میرے میاں جی! ان کا نام ارشد خان تھا۔ میں جب بیاہ کے آئی تو اللہ بخشے میری ساس حیات تھیں۔ سیدھی سادی نیکی کرنے والی، بس اپنے نماز روزہ میں مصروف رہتیں۔ انہوں نے گھر کی چابیاں میرے حوالے کیں اور دنیا سے تعلق توڑ لیا۔ ان کو پرواہ ہی نہیں تھی کہ پیچھے سے وہ بہت بڑے جاگیردار کی بیٹی تھیں۔ آگے شوہر اتنا بڑا صنعتکار اور بیٹا تاج اقتدار میں شامل ہو گیا۔ لیکن اللہ بخشے انہیں، انہوں نے حکومت میں ہوتے ہوئے اپنا دامن داغدار نہیں ہونے دیا۔ خیانت، کرپشن اور وعدہ خلافی نہیں کی۔ انہوں نے مجھے بڑا مان دیا۔ عزت اور محبت دی۔ کتنے ہی مصروف ہوتے مجھے وقت ضرور دیتے۔ رات گیارہ بجے ہم آئس کریم کھانے چلے جاتے۔ میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ان کی پسند اور کمزوری تھا۔ باہر کے ملک سے واپس آتے تو پیار سے کہتے زیب ساری دنیا میں رنگا رنگ کھانے کھائے لیکن تیرے ہاتھ کا پھلکا، مسور کی دال اور پالک گوشت...... (یہ ان کے پسندیدہ کھانے تھے) کہیں نہیں کھایا۔ جس دن انہوں نے آنا ہوتا میں یہ دونوں چیزیں بڑے ارمان، چاؤ اور خوشی سے بناتی، میرا انگ انگ ایسے مسرور ہوتا کہ مجھے دنیا جہان کی خوشی اور دولت مل گئی ہے۔ میں ان کا ذرا سا کام کرتی تو وہ میرا شکریہ ضرور ادا کرتے۔ جہاں سے لوٹتے میرے لئے تحفے ضرور لاتے۔ کپڑے، پرس، جیولری۔

بڑا مہمان نواز بندہ تھا۔ خاندان کا، محلے والوں کا دوستوں کا، اپنی ماں کا، اولاد کا سب کے حقوق کا خیال رکھنے والا۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے زندگی میں میری کوئی فرمائش ٹالی ہو۔ میں کچھ کہا نہیں کرتی تھی لیکن وہ ضرور پورا کر دیتے تھے۔ شروع میں ایک گاڑی تھی۔ وہ چیمبر آف کامرس جاتے، مجھے کہیں جانا ہوتا تو میں کہتی کہ ڈرائیور اور گاڑی بھجوا دیں۔ بعد میں انہوں نے مجھے گاڑی لے کر میرے نام کر دی وہ گاڑی اور ڈرائیور صرف میرے لئے تھا۔ چار ملازم گھر میں تھے۔ مگر مجھے اپنے ہاتھ سے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ میں نے گھر کو اپنا مرکز، اپنی جنت اور اپنی خوشی جانا۔ میاں جی میرے سر کا تاج، اماں جی گھر کی برکت اور اولاد میری دولت۔

اب میرے دونوں ہاتھ اور دامن خالی ہے۔ اماں جی اور میاں جی ملک عدم چلے گئے۔ جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا اور بچوں کو دنیا کھا گئی۔ میں خالی جھولی کے ساتھ رہ گئی۔ انہوں نے مجھے شادی کے پہلے دن کہا تھا زیب! میں سچا، کھرا اندر باہر سے ایک جیسا، زبان کا پکا،

نہایت ہی سادا بلکہ سادمراد بندہ ہوں۔ یہ پنجابی کا محاورہ ہے کہ میری مرادیں بھی تھوڑی ہیں۔''

زوبیہ سوچ رہی تھی جوانی اتنی شاندار، اور بڑھاپا ایسے ذلیل و خوار، تنہائی کے ہاتھوں لاچار، روح اور جسم دونوں بیمار، کسی اپنے کی قربت کیلئے دل بیقرار، ماضی کی یادوں سے فرار، نہ غم عشق نہ غم روزگار، پھر بھی ہم جینے سے بیزار۔ وقت کی اپنی رفتار، انسانی رویوں پہ احساس ضمیر اشکبار، بس رخصت کی اجازت کا انتظار۔ یہ دنیا جو بظاہر مشکبار اندر سے نہ کوئی اپنا نہ غم گسار۔

اب دو گھنٹے ہو چکے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی، ''لیبر روم میں ڈاکٹر خان کی بہن آسیہ آئی ہیں ڈلیوری تیار ہے آپ فوراً آ جائیں'' نرس بولی۔ ڈاکٹر زوبیہ نے سوالیہ نظروں سے زیب النساء کی طرف دیکھا وہ بولی

''آپ سے دل کی باتیں کرتے ہوئے میں بھول گئی تھی کہ آپ ڈاکٹر بھی ہیں۔ نہیں آپ مسیحا ہیں جو روح اور جسم دونوں کا علاج کرتا ہے۔ میں پھر کب آؤں، میں آپ کو فون کر لیا کروں......کبھی کبھی؟ اتنا وقت دینے کا بہت بہت شکریہ۔''

زوبیہ مسکراتی رہی سر ہلاتی رہی لگتا تھا اس کا سارا بوجھ اتر گیا ہے اس کی روح ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ اتنے میں نرس اندر آئی۔ زوبیہ نے کہا ''ان کی فیس واپس کر دو'' نرس نے حیران ہو کر دیکھا۔ ''پوری کی پوری؟''

''جی ہاں! پوری...... یہ آج سے میری دوست ہیں جب آئیں ان کو فوراً اندر بھجوا دینا، انتظار نہ کروانا''۔

زوبیہ نے ان کی تنہائی کا یہی علاج سوچا کہ نصیحتیں کرنے اور مشورے دینے کی بجائے وہ خود کو پیش کر دے، زیب النساء نے اس پیشکش پر بچوں کی طرح خوشی سے بے قابو ہو کر زوبیہ کو گلے لگا لیا۔

''بہت بہت شکریہ، اب مجھے زندگی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں مجھے کیا خبر تھی کہ آپ اتنی قریب ہیں۔ میرے سارے دکھ درد آپ نے سمیٹ لئے ہیں۔ اتنے میں دوبارہ فون کی بیل بجی۔ ''آ رہی ہوں بس راستے میں ہوں'' کوریڈور سے گزرتے ہوئے دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ زوبیہ نے کہا۔

''زبان ذاکر قلب شاکر، بدن صابر، زبان سے رب کا ذکر، دل شکر گزار اور بدن تکلیفوں پر صبر کرنے والا بنا لو اب خدا حافظ۔ جب جی چاہے چلی آیا کرو۔ میرے دل اور کلینک کے دروازے آپ کیلئے کھلے ہیں۔ شکوہ شکایت زندگی سے نکال دو، یہ ناشکری ہے۔ ہمیں جو کچھ ملا ہے کتنے لوگوں کو نہیں ملا۔''

''یہ کہہ کر آپ نے مجھے خرید لیا ہے''۔ وہ مسکرائی۔

''پھر تو یہ سودا بہت سستا ہے، صرف ایک وعدے پر۔ اللہ تعالیٰ بھی تو جنت کا وعدہ کرتے ہیں اور انسان اپنی جان دے کر شہادت کا رتبہ پا لیتا ہے۔''

''استغفر اللہ میں بہت گناہ گار ہوں اتنی نہ بڑھا پا کی داماں کی حکایت''۔

اور زوبیہ ایک نئی زندگی کے استقبال کیلئے لیبر روم میں داخل ہو گئیں۔

۞۞۞

حمیرا خالد

اندیشے

’’آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں ماما! مجھے یہ پروپوزل پسند نہیں۔‘‘

ماریہ نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے سہمی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے یہ کہتی ہوئی اٹھ گئیں کہ بیٹا سوچ کے جواب دیا جاتا ہے۔ بول کے سوچنے والے ہمیشہ پچھتاتے ہیں۔ تمھاری پسند اور مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں ہوگا اس کا اطمینان رکھو۔

سالک کے رشتہ میں اگر چہ کوئی قابل اعتراض بات تو نہ تھی۔ اچھی خاصی صورت شکل، تعلیم یافتہ اور خاندان بھی جانا پہچانا تھا۔ لیکن یہ ڈھیر سارے بہن بھائی اور ددھیال اور ننھیال کے رشتہ داران سب سے کون نبٹے گا، بس یہی بات ماریہ کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن یہ ماما کو کیسے سمجھائے...... کیسی بے تکی بات ہے۔ ایسی احمقانہ دلیل کیا وہ ماں کو دے سکتی ہے؟

انھی خیالوں میں غلطاں تھی کہ ثانیہ نے اسے ٹوکا دیا۔

’’کیا مسئلہ ہے کچھ ہم بھی تو جانیں‘‘ بہن نے شکل پر بارہ بجتے دیکھے تو سب کچھ سمجھ گئی۔ ماما کی زبانی تفصیل تو اسے بھی خوب معلوم تھی۔ ساری الجھن جان کر ثانیہ نے زور سے قہقہہ لگایا۔

’’بہت خوب تو گویا آپ کو یہ پریشانی ہے کہ اتنی بڑی فیملی میں اپنی من مانی کیسے کریں گی۔‘‘

’’من مانی کی بات نہیں۔‘‘ ماریہ نے چڑ کر کہا۔ ’’ثانیہ تم سمجھتی کیوں نہیں...... ماما کو دیکھا ہے اپنے گھر میں رہتے ہوئے بھی اب تک غیروں کی طرح ہیں۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے دس دفعہ دیکھتی ہیں۔ دادی جان کو ناپسند نہ ہو، دادا جان کے معمول میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔‘‘

اس کے تصور میں ماما کی تصویر گھوم گئی۔ متفکر اور پریشان چہرہ...... ماما آپ دادی جان سے ڈرتی کیوں ہیں...... اور ماما چونک اٹھتیں اور خفگی سے اسے جھڑک دیتیں۔ وہ دیکھا کرتی کہ جب کبھی دادی جان اچانک ان کے بیڈ روم میں آجاتیں اور ماما پاپا کے بیڈ پر لیٹ کر چاروں طرف گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا کرتیں۔ یوں جیسے نظروں ہی نظروں میں کونے کونے کی ویڈیو بنا رہی ہوں...... اس دوران ماما جلدی جلدی بکھری چیزیں سمیٹ رہی ہوتیں اور سانس روکے ان کے جانے کی منتظر دکھائی دے رہی ہوتیں کہ دادی جان بات تو کم ہی کیا کرتیں البتہ اپنے تاثرات سے بہت کچھ کہہ دیا کرتیں تھیں اور پھر دادا جان کے ساتھ اچھے اور برے تبصرے ہوا کرتے۔ ان کے بڑھاپے کی یہ بہترین مصروفیت تھی کہ یوں آمنے سامنے بستر پر لیٹے سارا وقت کہانیاں بناتے رہتے یا فرضی تانے بانے بنتے رہتے...... ان کے خیال میں اڑتی چڑیا کے پر گننے والے ہوشیار لوگوں میں سے وہ ایک تھے......

لگتا ہے دلہن کے میکے سے کوئی آرہا ہے وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرتے۔ تیاری تو یہی بتا رہی ہے۔ بچے بھی خوب صاف ستھرے دکھائی دے رہے ہیں اور ساتھ ہی ماما کی چلت پھرت پر خصوصی دوربین نصب ہو جاتی۔ یہی تشویش رہتی کہ ماما پتہ نہیں کیا کیا خاطر مدارات کر ڈالیں گی۔ ماریہ کو یہ بات سمجھ میں نہ آتی کہ آخر مہمانوں کی آمد یا ان کی تواضع پر ان کو اعتراض کیوں ہوتا ہے۔

ماما تو خاموشی سے اپنے کام سے کام رکھتیں اور حتیٰ الامکان کوشش کرتیں کہ کسی کے آنے جانے سے دادا دادی کے معمولات میں

کوئی خرابی نہ آئے۔

اسے اپنی ننھیال والوں کا فنکشن یاد آیا۔ کس طرح ماما نے چپکے چپکے تیاری کی۔ وہ بہت خوش تھیں مگر اپنی خوشی کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ یہاں تو یہ حال تھا کہ کسی کی آمد کی چاپ ہی سن لیں تو روزمرہ کے کھانے میں خوشبوؤں کی مہک کچھ زیادہ ہی آنے لگ جاتی۔ اور اگر کسی تقریب میں ماما کو جانا ہوتا تو دادی جان کی طبیعت خراب ہو جایا کرتی یہاں تک کہ پاپا کو جانے سے روک دیا جاتا۔ ماما صبر کا گھونٹ پی کر رہ جاتیں ...... کتنا اچھا ہوتا کہ اگر ماما انڈیپنڈنٹ ہوتیں۔ یوں اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے انھیں سب کے ناگوار رویے تو برداشت نہ کرنا ہوتے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ کل کو اسے بھی اس طرح گھٹ گھٹ کے جینا ہوگا۔ اس نے دبے لفظوں میں اپنے خدشے کا اظہار ثانیہ سے کر ہی دیا۔

''ثانیہ تم نے ماما کو نہیں دیکھا کیا!''

اس نے اشارہ دینا ہی کافی سمجھا۔ اسے یقین تھا کہ ثانیہ بھی ضرور تائید کرے گی لیکن ثانیہ نے بات کاٹتے ہوئے اس کے لاشعور میں چھپاں اس سارے نقشہ کو ہی الٹ کر رکھ دیا۔

''بے وقوف!'' ثانیہ نے جھلا کر کہا۔ ''یہ سارے مسئلے اور ماما کی یہ مظلومیت جو تمھیں دکھائی دے رہی ہے اس کی وجہ لمبی چوڑی اور بھری پری فیملی نہیں بلکہ مختصر فیملی ہے۔''

''وہ کیسے؟'' ماریہ نے حیرانی سے بہن کو دیکھا۔

''بھئی ہمارے گھر تھا ہی کون! بے چارے دادا دادی جان کی ایک اولاد بیٹا اور ہم دو پوتیاں ...... نہ ان کا کہیں آنا نہ جانا ...... کریں تو کیا کریں ...... پاپا گھر میں اور نہ ہم ...... ایک ماما ہی رہ جاتی ہیں، ان پر نظر نہ رکھیں تو کیا کریں۔

میری بہن سوچو ذرا جب گھر میں بہت سارے لوگ ہوتے ہیں تو کیمرہ ایک جانب نہیں رہتا بلکہ سب طرف گھومتا رہتا ہے۔ یوں کسی ایک پر زیادہ نکتہ چینی کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ خالہ امی کا کنبہ دیکھا ہے؟'' ثانیہ نے توجہ دلائی۔

''اتنے بیٹے اور بہوئیں ہیں کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں ہر عمر کے بچے الگ دھما چوکڑی مچائے رکھتے ہیں۔ گھر کا ہر فرد کسی نہ کسی دھندے میں مصروف رہتا ہے۔''

ماریہ کو ذہن کی گرہیں کھلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ثانیہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی ماما کتنی اکیلی تھیں کوئی بھی تو ان کا ہاتھ بٹانے والا نہیں تھا۔ شاید اسی لیے گھر کی فضا بوجھل بوجھل تھی۔ خالہ امی کے گھر کتنا مزہ آتا تھا۔ ماموں، ممانیاں، ہر عمر کے بہن بھائی چھوٹے بڑے سب آپس میں گھل مل کر رہ رہے تھے۔ ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ، بحث مباحثہ، ڈانٹ ڈپٹ سب کے سب آپس میں لگے رہتے۔ یہاں پریشانی کسی ایک کی تھی نہ خوشی تنہا تھی۔

اسے ماما کے الفاظ یاد آئے۔ ''بیٹا اس رشتے میں خوبی کی بات یہی ہے کہ سالک اکیلا نہیں، بہن بھائیوں کے ساتھ پلا بڑھا ہے۔ بھرے پرے کنبے میں پلنے والے بچے دینا لینا جانتے ہیں۔ خدمت لینا ہی نہیں خدمت کرنا بھی آتی ہے۔ اللہ نے کیا بہت سکھ ملے گا تجھے ...... یہ بہن بھائی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں ...... یہ تو شاک ابزاربر ہوتے ہیں، زندگی میں آنے والی ساری پریشانیاں، حادثے بڑھ کر تھام لیتے ہیں۔ مشکل سے نکالنے والے اللہ کے بعد اگر کوئی ہیں تو یہی ...... ورنہ انسان احساس تنہائی سے ہی ادھ موا ہو جائے۔''

اس کے اندر ایک تقابلی جنگ جاری تھی۔ جس میں ماما کا فلسفہ اور تجربہ غالب ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ ماما کی فراست اور تجربے کے مقابلے میں واقعی وہ ابھی بچی تھی۔ جب ہی تو ایسے کاموں کے لیے اللہ نے ولی کی شرکت کو ضروری رکھا ہے۔ آج اس پر اللہ کی حکمتوں کے راز کھل رہے تھے۔ ماما میں آپ سے فیصلے کا یہ حق چھیننا نہیں چاہتی۔ اس نے ماں کے فیصلے پر مطمئن ہو کر مہر ثبت کر دی۔ سکینت اور اطمینان کے فرحت بخش احساس نے اسے مسحور کر دیا۔

۞۞۞

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں

''بیٹھو نوجوان۔''

اس وسیع و پرآسائش دفتر میں داخل ہوتے ہی باس کی کرسی پہ براجمان صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ان کے دائیں اور بائیں جانب کرسیوں پر دو اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے اور ان تینوں کو مل کر میرا انٹرویو کرنا تھا۔

''شکریہ سر''۔ میں نے مسکرا کر کہا اور اطمینان سے سامنے موجود کرسی پہ بیٹھ گیا۔اب وہ تینوں میرے مقابل بیٹھے نہایت گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔

''تو کیا خیال ہے، انٹرویو شروع کیا جائے آپ کا؟'' انھوں نے نرمی سے مجھے مخاطب کیا۔

''جی ہاں۔'' میں تھوڑا بے تاب تھا کیونکہ پچھلے دو گھنٹوں میں پچیس امیدواروں کے بعد میرا آخری نمبر تھا اور انتظار کی یہ گھڑیاں خاصی صبر آزما تھیں۔

''یور گڈ نیم جنٹلمین؟'' پہلا سوال کیا گیا۔

''حیدر خان۔'' میں نے جواب دیا۔

''تعلیمی قابلیت تو آپ کے کوائف میں ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ اے گریڈ میں ایم بی اے کی سند اس بات کی ضامن ہے کہ آپ لائق طالب علم رہے ہوں گے لیکن دراصل اس جاب کے لیے صرف تعلیمی معیار اہم نہیں، بلکہ میں قابلیت کو ہر طرح سے جانچنے کے بعد فیصلہ کرتا ہوں۔''

درمیان میں بیٹھے صاحب نے جو غالباً کمپنی کے مالک تھے ٹھہر ٹھہر کر کہا تو میں کچھ چونک گیا۔ یہ جاب میرے لیے بہت اہم تھی۔ میرے والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کی بہت سی امیدیں مجھ سے وابستہ تھیں اور آج میں نہیں چاہتا تھا کہ امید کی یہ شمعیں بجھیں۔

''سر میں آپ کی ہر پرکھ اور جانچ پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔''

میرے پراعتماد لہجے پہ وہ تینوں مسکرانے لگے۔ دیوار پہ لگے فریم میں قائداعظم کی ایک خوبصورت تصویر جگمگاتی ہوئی یوں لگ رہی تھی جیسے کہتی ہو: ''شاباش بیٹا، ہمت رکھو۔''

''مسٹر حیدر، یہ بتائیے کہ اس سے پہلے بھی آپ کو کسی اور ملازمت کا تجربہ ہے؟''

''نہیں سر! میں دو سال سے نوکری کی تلاش میں ہوں۔ فی الحال کوئی جاب نہیں ملی البتہ بے شمار انٹرویوز دینے کا تجربہ ہے۔'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''اس کی وجہ؟ جبکہ تمھاری تعلیم ہر لحاظ سے موزوں ہے؟''

''سر رزق روٹی کا تعین کبھی کسی کی ڈگری یا تعلیم سے نہیں ہوتا۔ یہ نصیب کی بات ہے۔ مالک جو لکھ دیتا ہے اور جب لکھ دیتا ہے وہ مل کے رہتا ہے۔ دو سال میں نے ٹیوشنز پڑھا کر گزارا کیا ہے لیکن ہمت نہیں ہاری اور نہایت افسوس کے بعد ایک سچائی آپ کے سامنے رکھوں گا کہ ہمارے ملک میں جاب کے حصول کے لیے اکثر و بیشتر رشوت کا سہارا لینا پڑتا ہے جو میں نے کبھی استعمال نہیں کیا یا پھر کسی مضبوط سفارش کی ضرورت ہوتی ہے جو مجھے گوارا نہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''اگر بالفرض تمھیں یہ جاب بھی نہ ملی تو؟'' دوسرے صاحب نے شاید مجھے آزمانے کے لیے پوچھا۔

''سر پہلی بات تو یہ کہ اس نوکری کے حوالے سے میں بہت

پرامید ہوں لیکن پھر بھی نہ ملی تو میں خدا کی رضا سمجھ کر دوبارہ کوشش کروں گا۔''

''پڑھائی کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں کیسا رجحان تھا آپ کا؟''

''سر میں سکول کے دور سے ہی باسکٹ بال کا اچھا کھلاڑی رہا ہوں اور یہ شوق یونیورسٹی تک برقرار رہا۔ اس کے علاوہ شعروشاعری اور تقریر سے بھی دلچسپی ہے۔'' میرا لہجہ کچھ اور پرجوش ہو گیا۔

''اچھا یہ بتائیں آپ کے نزدیک دولت اہم ہے یا کردار؟''

''سر میرے نزدیک زندگی میں ان دونوں چیزوں کی الگ الگ انداز سے اہمیت ہے۔ بہتر زندگی ہر انسان کا حق ہے اور اس مقصد کے لیے دولت چاہیے۔ لیکن اس حد تک کہ قناعت اور حلال کا احساس باقی رہے۔ دولت نہ بھی ہو تو زندگی گزر جاتی ہے مگر کردار نہ ہو تو وہ کوئی زندگی نہیں۔ اس حوالے سے میں متوازن خیالات کا حامی ہوں مگر کردار بہرحال ہر لحاظ سے اہم ترین ہے۔'' میرے لہجے میں والدین کی تربیت بول رہی تھی۔

''تم اچھے خیالات رکھتے ہو نوجوان۔'' اس پذیرائی پہ مجھے دلی خوشی ہوئی۔

''اچھا سنو، ان دو میں سے ایک صاحب تو میری فرم کے ایم ڈی ہیں اور دوسرے جنرل منیجر۔ اب یہ دونوں تم سے آخری سوال کریں گے اور اس کے بعد تمھاری جاب کا فیصلہ میں خود کروں گا۔''

باس کی بات سن کر میرا دل ایک لمحے کو دھڑکا تاہم میں نے خود کو سنبھال لیا۔ متعدد انٹرویوز میں ناکامی کے باوجود میرے حوصلے پست نہیں ہوئے لیکن ایک بار پھر میں اس تلخ تجربے سے نہیں گزرنا چاہتا تھا۔ دونوں صاحبان نے باری باری مجھ سے معلوماتِ عامہ اور بزنس سے متعلق سوالات کیے جن کے میں نے ٹھیک ٹھیک جواب دیے۔ آخرکار فیصلے کی گھڑی آ گئی۔ کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ میں نے اپنی جانب سے بہترین کوشش کی تھی مگر بہرحال حتمی فیصلہ صاحبانِ اختیار کا ہی تھا۔

چند منٹ بعد باس گویا ہوئے:

''مسٹر حیدر آپ کے انٹرویو نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے۔ آپ سے پہلے جو پچیس امیدواروں کے انٹرویو ہم لے چکے ہیں ان میں سے آپ نہ صرف تعلیمی قابلیت، بلکہ مجموعی طور پر ہر لحاظ سے بہتر اور اس ملازمت کے اہل ہیں، لیکن......''

''لیکن کیا سر؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ آپ سے پہلے ہی یہ ملازمت کسی اور کو مل چکی ہے۔ چونکہ انٹرویو ایک رسمی کارروائی تھی، اسے پورا کرنا تھا لیکن بہرحال میں یہ کہنے پہ مجبور ہوں کہ آپ سے زیادہ ذہین کوئی دوسرا امیدوار دیکھنے کو نہیں ملا۔''

اس صاف اور کورے جواب سے مجھے شدید صدمہ ہوا۔

''سر آپ تو کہہ رہے تھے کہ میں......''

''ٹھیک کہا میں نے اور اب بھی یہی کہوں گا کہ آپ سے بہتر امیدوار یہاں موجود نہیں ہے۔ آپ ہر طرح سے اس ملازمت کو سوٹ کرتے ہیں مگر ہم مجبوراً یہ نوکری آپ سے قبل ایک امیدوار کامران شاہ کو دے چکے ہیں۔ وہ ایم این اے کا رشتہ دار ہے اور یہ مضبوط سیاسی سفارش تھی۔ آپ اتنا تو جانتے ہوں گے کہ ہمارے نجی ادارے ان بڑے لوگوں کی فیور اور فنڈز سے چلتے ہیں۔ ہم بھلا کیسے انھیں ناراض کرتے سو یہ کمٹمنٹ کرنی پڑی۔ ہاں تمھاری قابلیت کا اعتراف ضرور ہے۔''

نہایت سادہ اور بے رحم لہجے میں میرے ہوش اڑا دیے گئے تو میں بھڑک اٹھا۔

''کمٹمنٹ؟؟ آپ اسے کمٹمنٹ کا نام دے رہے ہیں سر؟ کھلے عام کرپشن ہے یہ...... ناانصافی، بے ایمانی اور دھوکہ دہی ہے...... مجھ جیسے بہت سے بے بس اور مجبور نوجوانوں کے ساتھ جن کی پشت پناہی یا سفارش کے لیے کوئی سیاسی یا عہدے دار خاندان نہیں ہے جو اپنے محدود وسائل میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور رشوت نہیں دے سکتے۔ جب آپ لوگ پہلے ہی یہ ملازمت فروخت کر چکے تھے تو پھر انٹرویو

والی رسم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ چلیں ہماری خیر ہے لیکن آپ کا وقت تو قیمتی ہے نا! بات صرف میری نہیں لیکن یہ تو سوچیں ایسے کتنے قابل امیدواروں کا حق آپ کے ناحق اور جانب دار فیصلوں کی وجہ سے مارا جاتا ہے؟ جب ہمارے ملک میں اہلیت کا معیار تعلیم کی بجائے اثر ورسوخ کی بنیادوں پر جانچا جارہا ہے تو پھر یہ شکایت کیوں کہ قوم کا نوجوان طبقہ دو نمبری اور شارٹ کٹ کا مرتکب ہے؟ اس کے پس پردہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اسے سامنے کیوں نہیں لایا جاتا؟ جس نوجوان کی حق تلفی ہو اس کے لیے آسان راستہ برائی اور شر کا ہوتا ہے اور یہی ہمارے ملک کی تنزلی کی وجہ ہے۔ سر! اتار دیں یہ دیوار پہ لگی قائداعظم کی تصویر جس کے نیچے بیٹھ کر آپ لوگ بڑے آرام سے بے ایمانی اور کرپشن کرتے ہیں۔ تو ہین ہے یہ ہمارے راہ نما کی۔''

میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے شدتِ جذبات میں اپنی بات مکمل کی اور فائل اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تینوں صاحبان بالکل ساکت تھے۔

''رکو نوجوان'' میں دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ ایک جوشیلی آواز آئی۔

''جی فرمایئے۔ لیکن میں اب اور کسی بات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ کیا انٹرویو کا کوئی مرحلہ باقی رہ گیا ہے؟'' میرے طنز کو بخوبی سمجھتے ہوئے وہ مسکرا رہے تھے اور میں الجھ رہا تھا۔

''یوں ہی سمجھ لو، یہ آخری مرحلہ ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ مارکیٹنگ کے شعبے میں منیجر کے عہدے پر تیس ہزار تنخواہ بمع مراعات تمھیں منظور ہے؟''

دوسری طرف سے یہ غیر متوقع پیشکش مجھے کسی خواب کی طرح لگ رہی تھی۔

''تمھاری قابلیت کا اندازہ تو انٹرویو کے دوران ہی ہو گیا تھا۔ آخر میں تو یہ چھوٹا سا امتحان لیا تھا ہم نے اور تم اس میں بھی کامیاب ہو گئے۔'' پہلی بار سراہتی نگاہیں مجھے پریشان کر گئیں۔

''کیسا امتحان سر؟''

''میں نے شروع میں ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ تعلیمی قابلیت کے علاوہ ہمارے جانچ کے کچھ اور مراحل بھی ہیں تو یہ وہی مراحل تھے۔ میں اس فرنچائز کا سربراہ ہوں۔ میرے نزدیک آج کل کے نوجوانوں میں ناکامی کی اہم وجہ خود اعتمادی کی کمی اور بزدلی ہے۔ قوم کے سپوت اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے سے گھبراتے ہیں۔ بے شک یہ ضروری نہیں کہ آپ کی صاف گوئی اور کھری بات ہر جگہ آپ کو کامیابی سے ہمکنار کرے مگر سچائی میں تاثیر ہوتی ہے۔ کرپشن اس لیے بڑھتی ہے کیونکہ لوگ برائی کو برائی نہیں سمجھتے۔ روک ٹوک کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں انھیں دبایا جاتا ہے۔ اپنے حق کے لیے بولنا ہی حق کو محفوظ کرنا ہے۔ چاہے وہ ملازمت کا معاملہ ہو یا کوئی اور۔ جب نوجوان حق گوئی، اعتماد اور راست بازی کے اصول اپنائیں گے تب ہی وہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اور ہاں جنٹلمین! میں خود تم سے بڑا عقیدت مند ہوں قائداعظم کا۔ میرے ادارے میں کرپشن، بے ایمانی اور حق تلفی جیسے رواج ہرگز نہیں ہیں کیونکہ تمام افسر اور ماتحت بہت ہی منتخب اور مخلص لوگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے تمھارا انتخاب کیا کیونکہ تم میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو میرے ادارے کی روایت قائم رکھیں گے۔'' انھوں نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی۔

''بہت بہت شکریہ سر! مجھے یہ ملازمت قبول ہے لیکن یہ سب کچھ ناقابل یقین لگ رہا ہے۔ کیا اس ملک میں ایسا بھی ہوتا ہے؟'' میرے لہجے میں خوشی اور تحیر کے ملے جلے جذبات تھے۔

''بالکل ہوتا ہے کیونکہ ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں'' اور تمھیں بتاتا چلوں کہ کامران رضا شاہ واقعی ایک سفارشی اور نااہل امیدوار تھا۔ وہ کسی صورت میرٹ پہ نہیں تھا اور میں نے اس سلسلے میں ہر قسم کی نرمی یا لچک سے واضح انکار کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ آزمائش مقصود تھی، سو جتنے بھی امیدوار مجھے اہل معلوم ہوئے میں نے سب سے یہی بات کہی مگر اپنا حق غصب ہونے کے باوجود کسی نے احتجاج نہیں کیا۔ یہ جرأت صرف تم نے کی اور یہ تمھاری قابلیت کا ایک اضافی پوائنٹ

تھا۔ میں اسی لیے ہر دفعہ ملازمت کے انٹرویوز خود لیتا ہوں تاکہ قائداعظم کی تصاویر محض لگی نہ رہیں بلکہ ان کے اصول وقوانین بھی جگمگائیں۔''

وہ انکشاف کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ حق وسچائی کی تعلیم تو میں نے کسی یونیورسٹی سے حاصل نہیں کی۔ یہ تو میرے والدین کی تربیت تھی جو ڈگری سے بڑھ کر کام آئی۔

''ٹھیک ہے مسٹر حیدر! کل سے آ کر آپ اپنا عہدہ سنبھالیں آج ہی اپائنمنٹ لیٹر مل جائے گا آپ کو۔ بہت بہت مبارک ہو۔''

میں نے تینوں صاحبان سے مصافحہ کیا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ میری نظر بے ساختہ قائد کی تصویر پر پڑی اور اسی پل مجھے یوں لگا کہ قائد واقعی مسکرائے ہوں۔

واقعی......ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں!

❁ ❁ ❁

امید

تاریکی اور اجالے کے ملاپ کا فسوں خیز منظر تھا۔ شفق کی سرخی فلک کے سنگھار میں اضافہ کر رہی تھی۔ نارنجی آگ کا گولہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور رفتہ رفتہ زوال کی طرف گامزن تھا۔ آسمان پہ کہیں کہیں بادلوں کے ننھے ننھے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ کچھ روئی کے گالوں جیسے سفید تھے اور کچھ کو نارنجی شعاعیں اپنی گرفت میں لے چکی تھیں۔ سورج کے وسط سے دائیں بائیں بادل قدرے گہرے تھے جیسے کسی نے عین وسط سے سرمئی خط کھینچ دیا ہو۔ دور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آفتاب کالے پانیوں میں اتر رہا ہو۔

مشرق کی سمت سفید چاند نمودار ہو چکا تھا۔ اس سارے منظر نے شب کی گود میں اداسی بھر دی تھی۔ اک سکوت تھا جس نے روئے شب کا حسین غازہ ڈھک رکھا تھا۔ یہی سکوت کھڑکی کے پار بیٹھے مصنف کو اپنی رگ رگ میں اترتا محسوس ہوا۔

مربع نما کمرے کی سلائیڈنگ ونڈو کے آگے گرے سلک کے نفیس پردے کو ڈوری کی مدد سے کھڑکی کے دائیں بائیں باندھ دیا گیا تھا۔ کھڑکی کے بالکل سامنے اک جہازی سائز بیڈ دھرا تھا جہاں مصنف بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے مسلسل آسمان پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ منظر کی دلفریبی اس پر اسی طرح سے اثر پذیر ہو رہی تھی جیسا کہ ایک تخلیق کار پہ ہوا کرتی ہے۔

قلم اس کے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان دبا ہوا تھا اور گود میں پڑا لیٹر پیڈ کسی تحریر کا منتظر تھا۔ لیکن...... مصنف کے اندر باہر مکمل خاموشی تھی۔

وہ کچھ لکھنا چاہتا تھا لیکن کوئی ایک موضوع اس کے ذہن کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو چلا تھا۔ وہ ایک لکھاری تھا۔ حروف اس کے آگے ہاتھ باندھے بکھرے پڑے تھے۔ لیکن شب کے اس پہر اسے ان کا چناؤ مشکل لگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان رنگا رنگ الفاظ کی مدد سے ''خوشی'' کے گیت لکھے یا ''غم'' کے نوحے تحریر کرے۔

اس کی آنکھوں کے سامنے خالی کشکول کھٹک رہے تھے۔ کرپشن اور ظلم و زیادتی کے بھوت ناچ رہے تھے۔ غربت اپنی درماندگی پہ ماتم کناں پھر رہی تھی۔ اس کے حساس دل نے وطن کی بھوک کو گہرائی میں جا کر محسوس کیا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ حکومت کی خود غرضی پہ قلم اٹھائے یا عوام کی بے حسی پہ...... دونوں پہلو اس کے لیے تکلیف دہ تھے۔

تاریکی بڑھ رہی تھی اس کے اندر کی اداسی بھی بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنی تحریر کے ذریعے بھی غم نہیں بانٹنا چاہتا تھا۔ مصنف کوئی ہلکی پھلکی سی تحریر لکھنا چاہتا تھا...... کوئی اچھوتی تحریر...... جو اپنے ہیپی اینڈ سے قارئین کو مسرور کر سکے لیکن حقیقتیں اس کا قلم جکڑے کھڑی تھیں...... تلخ حقیقتیں...... جن سے وہ چاہتے ہوئے بھی فرار حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔

چلو فرض کر لیتے ہیں......

اس کے دل نے ہولے سے سرگوشی کی۔

فرض کر لیتے ہیں...... ایک قصبہ تھا...... ''خوشحال پور''......

مصنف کا قلم تیزی سے حرکت کرنے لگا۔

وہاں خوشیوں کی پُروا چلتی تھی۔ امن و آشتی کے جھرنے بہتے تھے۔ قصبے کے سب سے اونچے درخت پہ بیٹھا ''کاگا'' محبت کے راگ

الا پتا تھا اور اخلاص وہاں کے باسیوں کی رگوں میں خون کی مانند دوڑتا تھا۔

محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے، ایک ہی تھال میں کھانا کھاتے اور ایک سے بچھونوں پہ استراحت فرماتے۔ قصبے کی گلیوں میں خوشحالی دوڑتی پھرتی تھی۔ اسی لیے وہ قصبہ ''خوشحال پور'' کے نام سے مشہور تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا شیر اور بکری کا ایک گھاٹ میں پانی پینے والا جملہ کسی نے اسی قصبے سے لیا تھا۔

وہاں تتلیوں کا بسیرا تھا اور جگنو رات کی تاریکی میں رقص کیا کرتے تھے۔ قصبے کے سب سے بڑے زمیندار کا نام ''سخی خان'' تھا۔ دور و نزدیک کے سبھی دیہاتوں میں اس کی سخاوت کے شہرے تھے۔ ایک روز سخی خان......

''یہ کیسی حماقت ہے۔''......دماغ کے ٹوکنے پہ مصنف کا ہاتھ رک گیا۔ بھوک ملک کو کھا گئی ہے۔ محبت و اخلاص، ہوس گیری کی دھول میں کہیں گم ہو گئے ہیں۔ امن بھکاریوں کی طرح گلی گلی کشکول لیے گھومتا پھرتا ہے۔ تتلیوں کے پر جل چکے ہیں اور جگنوؤں کی روشنی لحہ بہ لحہ معدوم ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ ایسے میں، تُو عوام کو کون سی دنیا میں لے جانا چاہتا ہے؟ خواب و سراب کی دنیا میں؟؟ تاکہ وہ آنکھوں پہ ''سب اچھا ہے'' کی پٹی باندھے ایک ایسی دنیا کی سیر کو نکل جائیں جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ تو انھیں حال سے بے خبر کرنا چاہ رہا ہے؟ بالکل ویسے جیسے نشہ کچھ دیر کے لیے انسان کو دکھ، غم، تکلیف سے بیگانہ کر دیتا ہے۔

یہ تو حقیقتوں سے منہ موڑنا ہوا۔ اور حقیقت سے منہ موڑنا ایک دانشور کا شیوہ نہیں۔

مصنف نے کاغذ کو گول مول کر کے ایک طرف اچھال دیا۔ جہاں پہلے سے ہی بہت سے کاغذ چرمر ہوئے پڑے تھے۔

اف ف ف ف......

تو پھر میں کیا لکھوں؟؟؟

اس کا دماغ ایک دفعہ پھر کسوٹی کھیلنے لگا۔

غم یا خوشی......غم یا خوشی......غم یا......

مصنف کا قلم بے قابو ہو کر قرطاس پہ ایک ترچھی لکیر بناتا چلا گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے چار موم بتیاں جل اٹھیں۔

چاروں کے رنگ مختلف تھے۔

ایک قندیل جس کا رنگ سفید تھا وہ قد میں سب سے چھوٹی تھی۔ بہت سا موم پگھل پگھل کر اس کے آس پاس جمع ہو گیا تھا۔ یوں جیسے وہ قطرہ قطرہ گھل رہی ہو۔ اس کا شعلہ بھی بہت دھیما تھا۔

اس کے بالکل ساتھ سبز قندیل روشن تھی۔ قد میں سفید قندیل سے ذرا اونچی......

سبز قندیل کے ساتھ گہرے نارنجی رنگ کی موم بتی تھی۔ وہ سفید اور سبز دونوں سے لمبی تھی اور اس کا شعلہ زبان کی شکل بناتا ان سے ذرا اونچا تھا لیکن اس میں اتنی چمک نہ تھی۔

سفید قندیل کے داہنی طرف پڑی موم بتی، قد میں سب سے اونچی تھی۔ اس کا شعلہ بھی اونچا اور نہایت چمکدار تھا۔ پیلے رنگ کی وہ قندیل ان میں سب سے خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

مصنف ابھی ان کے موازنے میں مصروف تھا کہ ہوا چلنے لگی۔ جس نے سفید قندیل کو لحہ بھر میں گل کر دیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد سبز قندیل کا شعلہ بھی بجھ گیا۔ نارنجی اور پیلے رنگ کی موم بتیوں کے شعلے ٹمٹمانے لگے۔

ہوا کے چلنے میں تیزی آ گئی ...... نارنجی رنگ کی قندیل کی مدافعت بھی دم توڑ گئی۔

مصنف نے دیکھا تینوں موم بتیاں بجھ چکی تھیں لیکن پیلی موم بتی روشن تھی۔ گو اس کا شعلہ بھی تیزی سے ٹمٹما رہا تھا لیکن بجھا نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ہوا تھم گئی اور اس کا شعلہ ایک دفعہ پھر سے پہلے کی طرح چمکدار ہو گیا۔

تینوں بجھی ہوئی قندیلوں کے پہلو میں پیلی قندیل پوری آن کے ساتھ روشن کھڑی تھی۔

مصنف اس روشن موم بتی کی جانب بڑھ گیا اور استفسار کرنے لگا۔

''بی قندیل! یہ کیا ماجرا ہے کہ ہوا ابھی سبک روی سے چلنا شروع ہوئی کہ یہ فوراً بجھ گئی (اس نے سفید قندیل کی طرف اشارہ کیا۔) اس کے بعد اس کا دم بھی نکل گیا۔ (مصنف نے سبز قندیل کی طرف اشارہ کیا)

ہوا میں تیزی آئی تو اس زرد قندیل کا زور بھی ٹوٹ گیا لیکن تم روشن رہیں...... ہوا کی تیزی تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکی......''

پیلی قندیل مسکرا اٹھی۔

''دیکھو صاحب! بات یہ ہے کہ یہ جو سفید قندیل ہے اس کا نام ''امن'' ہے۔ یہ مزاج کی بہت نازک واقع ہوئی ہے۔ پے در پے تکلیفوں نے اسے گھلا ڈالا ہے۔ اب حال یہ ہے کہ کوئی ہلکی سی افتاد بھی اس کی جان لے لیتی ہے۔

سبز قندیل کا نام ''مسرت'' ہے اس کی ''امن'' سے گاڑھی چھنتی ہے۔ یہ ''امن'' کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ امن کا ختم ہو جانا مسرت کے بھی چھن جانے کا باعث ہے۔

اور یہ جو گہرے زرد رنگ کی قندیل ہے ......'' پیلی قندیل ہولے سے مسکرائی۔ اداسی میں ڈوبی، افسردہ سی مسکان......

''اس کا نام ''محبت'' ہے۔ چھوٹی موٹی افتاد اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتی۔ یہ اپنے نام کے صدقے معمولی پریشانیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتی ہے لیکن جونہی حالات میں تیزی آتی ہے، سختی وجود چٹخانے لگتی ہے تو اس کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔''

''اور تم؟؟'' مصنف نے جلدی سے پوچھا۔

پیلی قندیل مسکرا اٹھی۔

''میں ...... میں ''امید'' ہوں۔ سیاہی میں روشنی کی کرنیں بکھیرتی امید...... میں کسی بھی حالت میں مایوس نہیں ہوتی۔ ہر طرح کے حالات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرتی ہوں۔ میں وہ واحد روشنی ہوں جو تیرگی کا سینہ چیرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ میرا اپنے رب پہ کامل یقین ہے کہ اگر حالات میں خرابی آئی ہے تو وہ سدھر بھی جائیں گے۔ ہوا کا رب اس پہ مکمل قدرت رکھتا ہے۔ اگر وہ اس میں تیزی لاتا ہے تو ایک وقت وہ بھی آئے گا جب وہ اسے روک لے گا......''

مصنف کی آنکھ کھل گئی۔ نجانے کس پہر سوچتے سوچتے اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ تاریکی اجالے پہ غالب آ گئی تھی۔ سورج نجانے کب کا ڈھل چکا تھا۔ سفید چاند میں روشنی بھر گئی تھی۔ افق کی سیاہ اوڑھنی پہ ستارے جھلملا رہے تھے۔

تو جو وہ دیکھ رہا تھا وہ اک خواب تھا!

خواب ......مصنف اپنے ذہن میں ایک دفعہ پھر سے اُسے دہرانے لگا۔ یکدم اس کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔ سرا ہاتھ لگ گیا تھا۔ وہ بھی الفاظ سے ''امید'' کا چہرہ تراشے گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔

چہار سو پھیلے مایوسی کے اندھیرے گھٹانے کو اُمید کی قندیل روشن کرنا بہت ضروری تھا......

۞۞۞

ساجدہ رفیق

حسن بیگانہ احساسِ جمال اچھا ہے

نام تو اس کا ''حیا تاں'' تھا مگر ظالم حیاتی نے اس سے کوئی حیات بخش سلوک نہیں کیا تھا اور یہ سب سمجھنے یا جاننے کیلئے کسی گہرے مشاہدے کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ اس کا چہرہ اس کے حالات کا آئینہ تھا۔

کبھی اس کا رنگ میدے شہاب جیسا بار ہو گا مگر گردش ایام کی دبیز تہہ نے اس کے شفاف حسن پر دھند جما دی تھی۔

اس کے ہاتھ میں میلی سی پلاسٹک کی بوتل تھی اور ساتھ آنے والی سات آٹھ سالہ بچی کے پاس سلور کی بالٹی تھی کثرت استعمال سے اس کا پیندا گھس چکا تھا اور کنڈے کی جو جگہ رسی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بچی اتنی خوبصورت اور گل گوتھنی سی تھی کہ میں نے بے اختیار اس سے گال چھو لیے وہ ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی۔ خدوخال اور چہرے کی بناوٹ سے پتا چل رہا تھا کہ یہ حیا تاں کی بیٹی ہے اور کبھی اس کی ماں بھی ایسے ہی شاہکار حسن کی مالک رہی ہو گی۔ کپڑے تو دونوں کے اڑی ہوئی رنگت والے اور میلے تھے شلوار اور قمیض میں کوئی میچنگ نہیں تھی البتہ دوپٹے دونوں نے سندھی سٹائل میں سر پر اوڑھ کر پلو پیچھے چھوڑے ہوئے تھے ماں کے پاؤں تک ننگے تھے مگر بچی نے دوپٹی کی گرد آلود چپل پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی بہن کے گھر سے پینے کا پانی لینے آئی تھی۔ اس کی بہن بھاونی کچن میں توے پر آلو بھون کر دوپہر کے کھانے کا بندوبست کر رہی تھی وہ دونوں سندھی ہیں کچھ دیر آپس میں باتیں کرتی رہیں جو کچھ میرے پلے پڑا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ حیا تاں کی اپنے شوہر سے لڑائی ہوئی ہے گھر میں کچھ کھانے کو بھی نہیں اور پانی تو ویسے ہی ادھر ادھر سے لا کر گزارہ ہوتا ہے۔ لڑائی کے بعد اس کا شوہر تو اپنے نشے کی طلب پوری کرنے کے لیے گھر سے نکل گیا تھا۔ پیچھے بیوی اور بچے اپنے پیٹ کی آگ اور پیاس کیسے بجھائیں گے یہ اس کا دردِ سر نہیں تھا۔

مجھ سے ملتے ہوئے اس نے اپنے چہرے پر بشاشت پیدا کرنے کی کوشش تو کی مگر وہ اپنی آنکھوں کی نمی اور ہونٹوں پر پڑا نیل نہ چھپا سکی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا بلکہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اس سے حال چال پوچھا۔ وہ بار بار اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے کھینچنے کی کوشش کرتی اور نادم سی ہو کر نظریں جھکا لیتی۔

میرے نرم ہاتھوں میں محبت کی جو گرمی تھی شاید وہ اسے نہ سہہ پائی اور آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہنے لگے میں خود بھی اس سے نظریں چرا رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھنا میرے لیے مشکل تھا میں تو بس اس کی ہتھیلی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی جن ہاتھوں کی لکیروں میں دھویں کی سیاہی بھری ہوئی تھی اور اس کی قسمت کے ستارے دھندلائے ہوئے تھے۔ اس ماحول میں انکار یا اپنی مرضی کا کوئی تصور نہیں سوا پنے ہوشربا حسن سے بے خبر نرگس کا وہ پھول کسی دیدہ ور کی نظر میں آنے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔

حیا تاں کی عمر اس وقت 25 سال ہو گی مگر وہ 45 سالہ کسی لاغر اور بیمار عورت کی شبیہ لگ رہی تھی۔ تین بچے تھے ایک بیٹی مول دو بیٹے اس سے چھوٹے تھے۔

بھاونی نے آلو توے سے اتار کر روٹیاں ڈالنی شروع کر دیں اور مول چولہے کے قریب جا بیٹھی۔ کپاس کی سوکھی شاخوں سے جلنے والی آگ کی تپش سے اس کے گال سرخ انگارے ہو رہے تھے وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی اگر کسی اچھے گھر میں پیدا ہوئی ہوتی اس ماحول میں ہیرے کی طرح چمکتی مگر گدڑی کا وہ لال تو اب بھی اپنی ضوفشانی بکھیر رہا تھا اور میرا ذہن اس کو بڑا ہوتا اور اپنی ماں کی طرح کسی دوزخ میں جلتا دیکھ رہا تھا۔ میں جھرجھری سی لے کر رہ گئی اور دل سے دعا کی کہ اللہ پاک اس

کی صورت کی طرح اس کے نصیب بھی روشن کر دے۔

بھوک کے باوجود اس نے رسمی سا انکار کیا مگر ہم نے اصرار کر کے اسے اور اس کی بچی کو کھانا کھلایا دس سال کے عرصے میں اس نے سکون کے کتنے دن دیکھے ہوں گے؟ زمینوں پر کام کر کے اس کا شوہر کتنا اناج لاتا ہوگا اور کیسے زندگی کی گاڑی چل رہی ہوگی یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اور پھر شوہر کو اپنے نشے کے لیے جب ضرورت ہوتی تو گھر کے برتن کبھی رلی، کبھی سندھی ٹوپی اور کبھی بیوی بچوں کے پہننے کے کپڑے اونے پونے بیچ کر وہ چند کش سگریٹ کے خرید کر بے سدھ ہو جاتا اور حیاتاں کی گندم صاف کر کے سندھی ٹوپیاں بنا کر یا پرانے بوسیدہ کپڑوں سے رلیاں بنا کر چند روپے کماتی اور گھر میں چھپا چھپا کر رکھتی کہ اگر شوہر کی نظر پڑ گئی تو دال روٹی کا آسرا بھی جائے گا۔ آج کی لڑائی کا سن کر تو مجھے اس کے شوہر سے گھن آنے لگی کہ گھٹیا پن اور بے حسی کی کوئی انتہا ہوتی ہے۔

حیاتاں نے بتایا کہ پچھلے ہفتے ہمارے گوٹھ میں فری میڈیکل کیمپ لگا تھا تو میں جو کافی عرصے سے پسلیوں میں درد اور بخار میں مبتلا رہتی تھی مفت علاج کا سن کر دوا لینے چلی گئی ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ لکھ دیئے اور دوا بھی دی۔ ٹیسٹ تو میں نے کیا کروانے تھے دوا کھانے سے مجھے درد کا افاقہ ہوا تو کیمپ کے آخری دن میں پھر دوا لینے چلی گئی۔ ڈاکٹر کے پاس کافی دوائیں بچی ہوئی تھیں جن میں وٹامن اور انرجی سیرپ وغیرہ تھے انہوں نے مجھے وٹامن کی گولیوں کے دو پیکٹ دے دیئے کہ یہ تم پندرہ دن کھانا تو کمزوری رفع ہو جائے گی اور کیپسول خاصے مہنگے تھے خریدنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی وہ لاکر میں نے اوپر برتنوں والی سلیب پہ رکھ دیئے دو تین دن میں مجھے کافی فرق لگا درد میں بھی کمی آئی اور کمزوری بھی کم ہوگئی مگر آج جب میں نے وہ دوا کھانے کیلئے ڈھونڈی تو نہیں ملی بچوں سے پوچھا مگر ندارد۔ دوپہر کو جب شوہر گھر آیا تو اس سے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا کہ مجھے نہیں پتا میرے منہ سے نکل گیا کہ ہائے وہ تو اتنی قیمتی دوا تھی میں تو لے بھی نہیں سکتی۔ بس چند لمحوں کے بعد ہی شوہر پھر گھر سے باہر چلا گیا۔ مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ دوا کہاں جا سکتی ہے گھر میں ہی ڈھونڈتی پھری کوئی آدھے پونے گھنٹے میں شوہر نشے میں دھت واپس آیا اور بستر پر لیٹ کر بے سدھ ہو گیا۔ گہری نیند میں کروٹ بدلنے پر اس کی قمیض کی جیب سے پچاس پچاس کے دو نوٹ گرے میں حیرت سے سوچنے لگی کہ کئی دن کی بے روزگاری کے بعد اس کے پاس پیسے اور نشہ پورا کرنے کا بندوبست کیسے ہوا۔ گھر میں بھی اب ایسا کچھ نہیں تھا کہ جو بیچ کر اسے اتنے روپے مل جاتے میں بھی بچوں کی بھوک سے مجبور ہو کر گھر سے نکلی کہ کسی سے ادھار آٹا لا کر روٹی کا آسرا کروں تو گاؤں کی چھوٹی سی دکان (جس میں عام ضروریات کی ساری چیزیں ملتی ہیں) کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر طاقت کے شربت اور وٹامن کی گولیوں کے پیکٹ پر پڑی میں بھوک کو بھول کر دکان والے سے پوچھنے لگی کہ یہ دوا تمہارے پاس کیسے؟ تو اس نے بتایا کہ ادا غلام علی اسے بیچ کر گیا ہے 150 روپے میں...... دکاندار کو کیا کہتی بس صدمے سے گنگ رہ گئی کہ میرے علاج کی خاطر خود تو کیا خرچ کرتا اپنے نشے کے لیے میری دوائی بھی بیچ دی بس اسی بات پر آج گھر میں جھگڑا ہوا اور اس نے ہاتھ اٹھایا اور میرے چہرے پر زخم بہت کم ہیں ان زخموں سے جو میرے دل پر لگے ہیں۔

ایسے ہی بے شمار قصے ہیں جو گاؤں گوٹھوں کے ہر گھر میں روز دہرائے جاتے ہیں اور پھولوں جیسی نازک اور حسین لڑکیاں روز کتنے زخم اپنے بدن اور دل پر سہتی ہیں۔ مگر وہی حالات اور معاشرے کے بندھنوں میں جکڑی گونگوں کی طرح زبان بند کیے زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں۔

ایسی خوبصورتی اور حسن کی مالک کہ اگر ذرا بہتر ماحول ملے تو اپنے ہنر اور صلاحیتوں سے دنیا فتح کر لیں مگر بے خبری اور لاعلمی کے صحرا میں بھٹک رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کتنے حقوق دیئے ہیں گھر کی ملکہ بنا کر جنت اس کی قدموں میں رکھ دی ہے مگر جہالت اور علم کی کمی نے انہیں اپنے حقوق سے بے خبر کر کے جہنم میں ڈال دیا ہے۔

دستکاری اور کشیدہ کاری کا فن ان کے پاس پیدائشی طور پر ہوتا ہے سب بچیاں خود ہی سیکھ جاتی ہیں اور اتنی خوبصورت ٹوپیاں رلیاں

شیشے کا کام، کٹ ورک کی بیڈ شیٹ بناتی ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔مگر حالات کے جبر سہہ کر ان کی صلاحیتوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ انہیں خود بھی اپنی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں اور یہی شائد اس معاشرے میں رہتے ہوئے ان کے حق میں بہتر ہے۔

میں اس سے پہلے بھی حیاتاں سے مل چکی تھی مگر کوئی 10 سال پہلے جب اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ سندھ میں ایسی جانے کتنی خوبصورت دوشیزائیں ہیں جو اس صحرا کی مٹی میں مل کر مٹی ہوگئیں۔سب کی کہانی بھی ملتی جلتی ہوتی ہے وہی روایات کی زنجیریں ہیں جو بیسویں صدی کے ختم ہونے پر بھی ٹوٹتی نظر نہیں آتیں۔آج بھی لڑکی کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی نسبت طے کر دی جاتی ہے کسی بھی ایسے مرد سے جس کی عمر اس کے باپ کے برابر ہوتی ہے یا ایسی کسی ٹریجڈی کے نتیجے میں کہ اگر پھوپھو یا بڑی بہن کا انتقال ہوگیا تو اب پیدا ہونے والی لڑکی بڑی ہوکر اس شخص سے بیاہ دی جائے گی چاہے اس کے بڑے ہونے تک وہ شخص دو چار شادیاں کرلے اور آٹھ دس بچوں کا باپ بن جائے مگر وہ بھتیجی یا چھوٹی بہن پیدا ہوتے ہی اس کی ملکیت اور امانت سمجھی جائے گی۔

ایسے ہی المیہ کے نتیجے میں حیاتاں اپنی پیدائش کے بعد اپنی پھوپھو کا انتقال ہو جانے پر اپنے 35 سالہ پھوپھا کی ملکیت بن گئی اور ذرا بڑی ہونے پر جب حیاتاں 15 سال کی نازک سی کلی تھی تو اس 50 سالہ مرد کو سونپ دی گئی جس کی پہلے بھی ایک بیوی موجود تھی مگر ادھیڑ عمری اور بے اولادی کے دکھ نے اسے جلد ہی اپنی ازلی منزل پر پہنچا دیا اور وہ حیاتاں کی شادی کے چھ ماہ بعد اللہ کو پیاری ہوگئی۔

غربت ویسے بھی فساد کی جڑ ہوتی ہے مگر جب شوہر نشے کا عادی ہو تو عورت کی زندگی ویسے ہی جہنم بن جاتی ہے۔تو وہ حسین پھول اس جہنم کی آگ میں ڈال دیا گیا۔ایک ہی جیسے کرداروں کے ساتھ ایک اور بے نام کہانی نے جنم لیا اور چپ چاپ اپنے اختتام کی طرف بڑھتی چلی گئی......شاید ایک اور کہانی کی بنیاد رکھ کر۔

☆☆☆☆

نصرت یوسف

اِرحَمنِی

بات چیت سے سکندر کو اندازہ ہوا کہ بچوں کے بیڈروم کے لیے ڈیزائنر بیڈ تیار کرنے کی بات چیت ہو رہی تھی۔ رقم کا انہوں نے کوئی ذکر سکندر کے سامنے نہیں کیا اور کچھ ہدایات دے کر فون ختم کر کے سکندر کی طرف بڑے مسکراتے ہوئے متوجہ ہو گئے۔

''آؤ بھئی سکندر کہاں غائب ہو آج کل، کہیں تقریبات وغیرہ میں بھی نظر نہیں آتے۔ آج کیسے ہمیں یاد کیا۔''

آفس کی ریوالونگ چیئر پر بیٹھے انہوں نے گھوم کر سامنے رکھی فرنیچر کیٹلاگ اٹھا کر سائیڈ میں رکھ دیں تو سکندر کو اچانک اپنا حلق سوکھتا محسوس ہونے لگا۔ ''بات کیسے کروں؟؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا ادھر بھائی ذکا اس کو کھوجتی نظروں سے دیکھنے لگے کہ ان کا سیل فون بج اٹھا۔ چند لمحے دوسری طرف کی بات سننے کے بعد ان کے ماتھے پر رگ ابھر آئی۔

''آپ پندرہ دن کے لیے کہہ رہے ہیں میں آپ کا کام پندرہ گھنٹوں کے لیے بھی کرنے سے قاصر ہوں۔ آپ خود جانتے ہیں حالات کیسے چل رہے ہیں، دال روٹی چل رہی ہے اس کا کرم ہے، میرے پاس ہوتے تو میں اس نیک کام کیلئے قرضہ نہیں بلکہ چندہ دیتا۔''

سکندر کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا۔ بھائی ذکا نے ایک بار پھر بھر پور مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے سکندر کو دیکھا جو ان کا چچا زاد بھائی تھا۔ ''عبدالکریم کا فون تھا سیلاب زدگان کیلئے کچھ مخصوص رقم اندرون سندھ بھیجنی تھی وہ فوری طور پر پوری نہیں ہوئی تو مجھ سے قرض مانگ رہا تھا۔ اب ان کو قرض دو یا اپنے خرچے پورے کرو، اپنے بال بچوں پر خرچ کرنا بھی تو حدیث نے صدقہ کہا ہے۔''

بھائی ذکا نے دونوں کے مشترکہ کزن کا ذکر کیا جو کسی فلاحی تنظیم کے ساتھ جڑے اپنے وقت اور مال کی زکٰوۃ دیتے رہتے تھے۔ سکندر چپ چاپ ان کی شکل دیکھتا رہا کہ اب تو کچھ کہنا بھی فضول تھا۔ مہربان رب نے مہربانی کی، دست سوال دراز کرنے سے پہلے ہی عزت رکھ لی۔ یوں ہونے کو تو اس کے اپنے دونوں بڑے بھائی چٹکی بجاتے یہ مسئلہ حل کر سکتے تھے۔ کرنسی کا کئی گنا فرق ان کی تھوڑی رقم کو بھی خوب بڑھا دیتا لیکن ان کے دیئے پانچ لاکھ کو بھی وہ اپنی گاڑی اور شفق کا بچا کھچا زیور بیچ کر دو سال پہلے ان کے بار بار تقاضوں کے بعد ادا کر پایا تھا۔ تب بھی محض چار لاکھ بیس ہزار اس کے ہاتھ آئے جسے بھائیوں نے لیتے ہوئے صاف جتایا کہ اس پر اسی ہزار واجب الادا ہیں۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ ان کا مشکور تھا کہ انہوں نے فی الحال قبول کر کے اسے ایک بوجھ سے آزاد کیا۔

کبھی کبھی وہ حیرانی اور اذیت دونوں کے بین بین ہو کر سوچتا کہ قسمت نے ایک باپ کے چار بچوں میں سے اس کو کیوں سختیوں کے لیے چن لیا ہے؟ سارے ناز انداز اور رعنائیاں صرف اس سے ہی کیوں واپس لے لی گئیں؟؟ اس کی آنکھوں کے آگے اپنے دونوں بھائیوں اور بہن کی زندگیوں کے نقشے آنے لگتے۔ ایک میں ہوں محض 2 لاکھ کیلئے خوار ہو رہا ہوں۔

بھائی ذکا سے لاحاصل ملاقات کے بعد اس نے اپنے دوست الیاس چمکی سے رقم قرض لینے کا سوچا۔ الیاس اس کے سکول کے زمانے کا دوست تھا اور دور پرے کا عزیز بھی۔ بہت عرصے سے اس

کا الیاس سے کوئی رابطہ نہ ہوا تھا۔ کسی نہ کسی طور وہ الیاس کا فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پہلی ہی بیل پر فون جس نے اٹھایا، اسے سن کر سکندر کو بے اختیار برسوں پہلے کا کھلنڈرا سا لڑکا یاد آ گیا جو اس کا دوست تھا۔ جس کے ساتھ وہ کتنی ہی شامیں اپنی گاڑی میں خوب تیز ڈرائیونگ کرتا گزارتا تھا۔ آج بھی وہی بے فکری، وہی خوش باشی اس کے لہجے میں رچی تھی۔ ''زندگی خاردار نہیں میری طرح اس کی!'' بے اختیار اس نے جملہ سوچا اور اپنا تعارف کرایا تو اگلے لمحہ کو خاموشی چھا گئی اور پھر وہ بولا تو سہی مگر ایک اعلیٰ ترین سرکاری عہدے پر فائز الیاس کو سکندر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ رسمی سی بات چیت کے بعد جب کال ختم ہوئی تو سکندر کا دل بوجھل ہو چکا تھا۔

سائرہ آپا بھی ماہ بھر سے ملک سے باہر تھیں۔ اور فی الحال ان کی آمد کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ ''یا خدا مجھے اپنی مخلوق کے آگے مذاق نہ بنانا'' وہ دن میں کئی بار رب سے فریاد کرتا وقت گزرتا جا رہا تھا قرض کی ادائیگی میں محض ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔ اب تو اس نے شل ہوتے اعصاب کی توڑ پھوڑ سے مجبور ہو کر شفق سے بھی ذکر کر دیا تھا اور وہ تو بس گنگ ہی ہو گئی تھی۔ اس کا کمزور پڑتا چہرہ یکدم زرد ہو گیا تھا۔ اور پھر وہ بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سکندر بے بسی کے عالم میں اپنی محبوب بیوی کو روتا دیکھتا رہا۔ گو اس کا بھی یہ ہی کرنے کو دل چاہ رہا تھا لیکن رات کے اس پہر جب بچے روٹی پودینہ کی چٹنی کے ساتھ کھا چکے تھے وہ کوئی آواز نکال کر انہیں جگانا نہ چاہتا تھا۔ سو تیزی سے اٹھ کر دروازہ بند کر کے وہ صرف اتنا بولا۔ ''اپنا عذاب بچوں تک نہ جانے دو شفق، خدارا چپ ہو جاؤ۔'' پانی کا گلاس بڑھاتے ہوئے اس نے بیوی کا کندھا ہلا دیا۔

''اب کیا ہو گا سکندر؟؟'' اس کی آنسو بھری آنکھیں سکندر پر جمی تھیں۔ ''فکر نہیں کرو، ایک دو لوگ ہیں میری نظر میں، امید ہے ہمارا کام بن جائے گا۔ انشاء اللہ...... سائرہ آپا ہوتیں تو کوئی فکر کی بات ہی نہ تھی۔ فوراً ہی کام ہو جاتا۔'' اس نے بیوی کو وہ تسلی دی جس پر اسے خود بھی کچھ خاص یقین نہ تھا۔ ہاں سائرہ آپا پر اعتماد باقی تھا۔

اور پھر وہ بھائی فیض کے پاس سے اپنی تمام تر خود داری بالائے طاق رکھ کر بے فیض ہی لوٹ آیا۔ ہاں وہ ایک خوبصورت سا کارڈ تھمانا نہیں بھولے جوان کی بیٹی کی شادی کا تھا۔ شہر کے گراں ترین ہال میں اس کا بیوی بچوں سمیت بلاوا نہ جانے کتنے دنوں کا تھا یہ دعوت، وہ دعوت، اس بات کی دعوت، اس بات کا فنکشن، بے جان ہاتھوں سے کارڈ تھامتے ہوئے اس کی نگاہ سامنے رکھے کمپیوٹر سکرین پر پڑی جس پر چیٹ روم ونڈو نظر آ رہی تھی۔ بہ اختیار اس کا دل چاہا وہ بھی سب کو بتائے کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ عجب سی خواہش ابھری اور پھر وہ واقعی باہر آ کر نیٹ کیفے کی طرف چل پڑا۔ دوپہر ہو چلی تھی۔ اسے اپنے کام پر جانے کا کوئی خیال نہ تھا۔ ''نہ جانے قسمت میں کیا ہے؟'' نیم تاریک کیفے میں اپنے سامنے رکھا کمپیوٹر آن کر کے وہ بہت شکستہ تھا۔ شادی کارڈ اس نے راستہ میں ہی کہیں گرا دیا تھا۔ نہ جانے کہاں اور کب گرا، بالکل اس طرح جیسے نہ جانے کب اور کیسے زندگی کی سختیاں اس کے ساتھ نتھی ہوتی چلی گئیں۔ اس نے آنکھ ایک بالکل مختلف ماحول میں کھولی تھی اور اس کی موجودہ زندگی میں ان سہولیات کا ذکر بھی محض دیوانے کی بڑ ہی تھا۔ نعمتوں کا یہ زوال اس کی ورح کو کیفے میں غائب دماغی سے سکرین تکتے ہوئے بری طرح چٹخا رہا تھا۔ وہ دنوں سے رونا چاہ رہا تھا اس وقت رو رہا تھا بے آواز آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے ادھر ادھر گم ہو رہے تھے۔ وہ دیکھے جانے، تبصرہ کیے جانے کے ہر خوشہ سے بے نیاز اپنے خیالات کے عذاب میں گم تھا۔ برسوں پہلے جب وہ بی، بی اے کر رہا تھا ابا جان نے اسے پورے پچاس ہزار کا ڈیسک ٹوپ خرید کر دیا تھا۔ جو چند سالوں میں آدھی قیمت کا بھی نہ رہا تھا۔ مگر سکندر کی ہنستی مسکراتی زندگی میں کوئی غم جگہ ہی نہ بناتا تھا۔ اس نے

نئی آنے والی ٹیکنالوجی انٹرنیٹ کا بھی خوب خوب استعمال کیا تھا۔ گراں ترین قیمت پر انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں میں سے ایک سکندر عالم بھی تھا جسے چیٹنگ کی دنیا میں ڈنائٹ پرنس کے نام سے جانا جاتا تھا۔تھرل اینڈ ایکشن کے نام سے موجود چیٹ روم میں وہ ہر ویک اینڈ جب آن لائن ہوتا تو مخصوص لوگ اس کا پرجوش استقبال کرتے۔آہ! خواب ہوئے وہ دن اور وہ راتیں!! وہ خواب کی سی کیفیت میں کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا۔چیٹ روم میں وہ داخل ہو چکا تھا۔دماغ میں محفوظ پرانی یادیں دھیمے دھیمے زندہ ہو رہی تھیں۔آنسو گرنے بند ہو رہے تھے۔اچانک ایک میسج ابھرا''بدلہ لینا ہی بہادری ہے۔''اس میسج کے ابھرتے ہی کتنے ہی آن لائن ممبرز نے اپنے اپنے تبصرے بھیجنے شروع کر دیئے۔یہ کامن روم تھا سب کے میسجز یکے بعد دیگرے ابھر رہے تھے۔سکندر غائب دماغی سے نگاہ ڈال رہا تھا۔اچانک اس نے بدلہ اور بہادری کا تعلق جوڑنے والے کو علیحدہ ونڈو پر، ہیلو لکھ دیا اور پھر ان کی بات شروع ہو گئی۔

کرمانی سکندر ہی کے شہر کا تھا۔سکندر کا بھرا ہوا دل بہت جلد کرمانی کی ونڈو پر اپنے زخم تحریر کر چکا تھا۔بلاتکلف کرمانی نے اسے بتایا کہ وہ بطور تھرل کئی ڈاکے اپنے کالج فرینڈز کیساتھ ڈال چکا ہے۔ ہم سب دولڑکے اور دولڑکیاں طاقتور والدین کی اولادیں ہیں۔اگر کبھی پکڑے بھی گئے تو عزت کے ساتھ رہا کر دیئے جائینگے اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے ٹائپ کیا تھا۔سکندر تو یہ پڑھ کر گنگ ہی ہو گیا تھا۔ سکرین کو گھورتے ہوئے اس کی انگلیاں کی بورڈ پر ٹائپنگ کرنا رک چکی تھیں۔تمہاری کہانی بڑی ٹریجک ہے۔المیہ مسرت میں تبدیل ہو سکتا ہے اگر تم چاہو۔کرمانی نے سکندر کے طویل خاموش وقفہ سے بور ہو کر میسج بھیجا۔''کیسے؟؟''سکندر کی انگلیاں متحرک ہو کر پیغام بھیج چکی تھیں۔''تمہیں ہمیں کوئی ایسا ہدف بتانا ہوگا جہاں سے مال بھی ملے اور کوئی ہنگامہ بھی نہ کھڑا ہو۔اگر تم ایسا کرتے ہو تو ہماری کامیابی کے فوراً بعد ہی تمہارے اکاؤنٹ میں دو لاکھ منتقل کر دیئے جائینگے۔ یہ صرف تمہارے لیے ہے۔میں نے آج تک ایسی آفر کسی چیٹر کو نہیں دی......ہمیں نہ اس کی ضرورت ہے اور نہ خواہ مخواہ نیک ولن بننے کا شوق......پھر قہقہہ......

سکندر کے اندر اتھل پتھل ہونے لگی۔اضطرابی کیفیت میں اس نے جو ٹانگ ہلائی تو کوئی تار ہل گیا اور سکرین یکدم تاریک ہو گئی۔رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔اس نے رکا رکا سا سانس خارج کیا اور سکرین کو خواہ مخواہ تکنے لگا۔''2 لاکھ راتوں رات! مگر ذرا ڈاکے کے بعد! کون سا میں ڈال رہا ہوں؟''اندر سے ابھرتی آوازوں کو روکنے کیلئے وہ کھڑا ہو گیا۔سیل بھی وائبریٹ ہو رہا تھا سائرہ آپا کا نام دیکھ کر اسے جیسے اپنے اوپر سے پریشانی کی چٹان کھسکتی محسوس ہونے لگی۔کیفے سے باہر آ کر اس نے کال ریسیو کی۔کچھ دیر پہلے بھاری ہوتا سر جیسے ان سے باتیں کر کے پرسکون ہونے لگا تھا۔''کل رات ہی پہنچی ہوں تمہیں پتہ ہے ناں اپنے بہنوئی کا، کوئی نیا کام شروع کرتے ہوئے کس قدر محتاط رہتے ہیں اس لیے ہی بنگلہ دیش میں اتنا وقت لگ گیا۔آؤ نگی تمہارے گھر کسی وقت میں، چوتھی منزل تک لفٹ نہ ہو تو مسئلہ ہوتا ہے؟ تم آجاؤ سپیشل مٹھائی تھی تم لوگوں کیلئے وہ آ کر لے جاؤ۔''

سائرہ آپا نے اپنا حال چال سنایا سکندر کو آنے کا کہہ کر جو فون بند کیا تو انہیں امید بھی نہ تھی کہ وہ اگلے دس منٹ بعد ان کے سامنے موجود ہوگا۔حیران تاثرات کیساتھ انہوں نے بھائی کو دیکھا جس کی کیفیت خوب شکستہ لگ رہی تھی۔بجھی بجھی سی آنکھوں میں مسرت کی کوئی بھی رمق نہ تھی۔

''آپا چوتھی منزل کا کہہ کر آپ ہمیشہ ہی نہ آنے کا بہانہ کر لیتی ہیں۔لفٹ ہمیشہ تو خراب نہیں رہتی، سال بھر سے اوپر ہو گیا آپ کو اور آپ کے ہاں سے کسی کو بھی آئے ہوئے۔''سکندر نے بہن سے دھیمی آواز میں شکوہ کیا تو وہ دھیما سا مسکرانے لگیں۔اب وہ کیا بتاتیں انہیں اور ان کے گھر والوں کو اس طرح کے گھروں میں آنا جانا کچھ خوشگوار نہیں لگتا جہاں کھڑکی سے کھلے آسمان کے بجائے دوسری عمارت کے مٹے مٹے در و دیوار نظر آتے ہوں۔چھوٹے تنگ

تنگ سے کمرے ہوں جن میں تازگی اور فرحت کا کوئی تاثر نہ ابھرتا ہو۔ پھل، پھلواری، سبزہ، آنکھوں کو تراوٹ نہ دیتا ہو، نازک مزاج لوگوں کا ایسی جگہوں پر کیا کام، نہ جانے وہ یہ کیوں بھول گئی تھیں کہ سکندر بھی ایسا ہی نازک مزاج تھا۔ان ہی میں سے تھا۔اس کی زندگی تبدیل ہوگئی تھی تو ان کی بھی ہوسکتی تھی۔ ایسا وہ کیوں سوچتیں؟ ان کے میاں کے مقدر کا ستارہ وقت کے آسمان پر چمک گھٹانے کے کوئی آثار نہ دکھا رہا تھا۔ حالانکہ زوال کا عمل شروع ہونے میں محض لمحہ ہی لگتا ہے لیکن انسان جب مگن ہوتا ہے تو اسے زندگی کی حقیقتیں کم ہی سوجھتی ہیں۔ بڑے انداز سے صوفہ پر ٹکتے ہوئے انہوں نے بیٹی اسما کو آواز دی۔ ''اسما بیٹا ماما جی آگئے ہیں......ان کا ڈبہ تو لا دو۔''

سکندر نے بے آرامی محسوس کرتے ہوئے آرام سے بیٹھی بہن کو دیکھا اور اپنی گزارش پیش کرنے کیلئے الفاظ سوچنے لگا۔ بہن کے اچانک یوں واپس لوٹ آنے سے اسے قسمت سے شکوہ چھٹتا ہوا لگنے لگا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ سائرہ آپا کے ہاں سے وہ مایوس نہیں لوٹے گا۔ وہ اس سے محبت کرتی ہیں اس کا ہاتھ ضرور تھامیں گی۔ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر موجود گہری لکیروں کو دیکھتے ہوئے سوچ گیا۔ ''ہاں بھئی سکندر کیسا چل رہا ہے سب کچھ، تمہارا نیا بزنس؟'' سائرہ آپا کی اپنائیت بھری آواز نے اس کو متوجہ کیا۔ ''بس آپا بہت ٹف ٹائم ہے اس وقت میرا۔''

''اچھی بھلی نوکری چھوڑ کر نہ جانے کیا سوجھی تھی تمہیں آئس کریم کا کام کرنے کی۔'' سائرہ آپا کا لہجہ سکندر کی بات سن کر تیکھا ہوگیا تو وہ چونک کر بہن کو دیکھنے لگا وہ عمومی حالات میں شاید اپنی صفائی میں کچھ کہتا۔ مگر اب اس نے بے ساختہ ان کے ہاتھ تھام لیے، ''آپا مجھے دولاکھ کا قرضہ اتارنا ہے فوری، ورنہ میں اور میرا خاندان رل جائے گا۔''

وہ بمشکل اپنی آواز کی تھرتھراہٹ پر قابو پا سکا تھا۔ کاروبار ختم ہونے کی صورت میں زندگی کس نہج پر ہوگی اس کے تصورات اسے ہولا رہے تھے۔ اور کاروبار رہنے کی صورت میں اچھے دنوں کے تصور کے خواب بھی اس کی اور اس کے خاندان کی آنکھوں میں ٹوٹے کانچ کی طرح چبھ رہے تھے۔ وہ ہر صورت اپنی بقا کا یہ راستہ کھونا نہیں چاہتا تھا......اپنے لیے......اپنے بیوی بچوں کیلئے......

آپا سائرہ نے بھائی کے چہرے پر ابھرتے تاثرات پر بڑی ہمدردی بھری نگاہ ڈالی اور اپنا قریب رکھا بیگ اٹھا لیا۔ سکندر کا دل ان کے ہاتھوں کی جنبش دیکھ کر جیسے چمکنے لگا۔ رواں رواں بے اختیار سا ان کے حق میں دعائیں کرنے لگا۔ انسان بھی کیا چیز ہے، رب کا اتنا شکرگزار ہو تو رب اسے بے رحم بندوں سے محفوظ بھی کر لے۔ سکندر کو بھی یہ ہی لگا کہ اسے رب نے ظالم لوگوں سے بچا لیا ہے۔ سائرہ آپا بس اس کی تمام اذیتیں دھوڈالیں گی۔

بے صبرا انسان!!! کتنی جلد اپنے جیسے انسانوں سے توقعات باندھ لیتا ہے۔ سائرہ آپا نے اپنا ہاتھ باہر کیا تو اس میں ہزار ہزار کے نئے نوٹ تھے۔ یہ رکھ لو، پورے پچاس ہیں سکندر نے ویران آنکھوں سے بہن کو دیکھا...... وہ تو سمجھ رہا تھا کہ بس بہن ایک چیک کاٹ کر دے گی اور اس کی خودداری اور عزت نفس جس کا اشتہار لگا کر اس نے مدد مانگی تھی اس کا احساس کر لے گی۔ اس نے تو بہن کو مینار کی طرح سوچا تھا۔ اس کی آمد کی اچانک خبر نے جیسے اس میں روح سی پھونک دی تھی۔ کیا وہ محض فریب تھا؟

وہ ہونٹ بھینچے ایک دم پرے کھسک گیا۔ سائرہ آپا نے اچنبھے سے دیکھا۔ ''آپا اس میں میرا کام نہیں بنے گا۔ مجھے دولاکھ کا قرضہ اتارنا ہے۔'' ایک بار پھر سکندر نے اپنی غیرت کچلتے ہوئے سوال دہرایا جسے آپا نے سنا اور چپ رہیں۔

''تمہاری ضرورت اپنی جگہ ہے لیکن تمہاری مطلوبہ رقم کا بندوبست میں نہیں کر سکتی۔ ہاں یہ چاہو تو رکھ لو۔ یہ بھی کل ہی ملک لوٹنے سے پہلے ڈالرز کیش کرائے تھے۔''

سائرہ آپا کی آواز میں انکار سن کر ناراضگی کا تاثر واضح ہو چکا تھا۔ جبکہ سکندر کو ان کے گھر کے کسی حصے میں چلنے والی ڈرل مشین کی آواز سے وحشت سی ہونے لگ گئی تھی۔ اندر داخل ہوتے اس کی نگاہ

گھر کے کھلے حصہ میں موجود مزدوروں پر پڑی تھی۔ اچھا بھلا صاف ستھرا فرش ختم کرا کر سائرہ آپا ٹائلز لگوا رہی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں بھی کام ہوتا رہا تھا۔ اب تقریباً ختم ہونے کو تھا۔ اجلا، چکنا روشنیاں بکھیرتا ٹائلز کا فرش سائرہ بیگم کی آنکھوں میں فخر سا جگا رہا تھا۔ انہوں نے بھائی کے ماند پڑے چہرے کو لمحہ بھر کیلئے فکرمندی سے دیکھا جو رقم ہاتھ میں لیے بغیر جانے کو کھڑا ہو گیا تھا اور پھر وہ چلا گیا۔

نوٹ اپنے بیگ میں واپس رکھتے ہوئے ان کی مخملی پاؤچ میں ملفوف کسی شے سے ٹکرائیں تو انہوں نے اسے بڑی احتیاط سے باہر نکال لیا۔ سفید اور کالے نگینوں کے جڑاؤ طلائی کنگن دیکھ کر ان کے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ آ گئی۔ دونوں کنگن کے ساتھ وزن اور قیمت کا ٹیگ بھی موجود تھا۔ یہ ٹھیک اتنی ہی رقم بن رہی تھی جو سکندر کو در در پھرا رہی تھی۔ بڑے خوشگوار موڈ کے ساتھ انہوں نے اپنی دیورانی کا فون ملایا۔

''بھئی موی بہت شکریہ......تم نے واقعی میرا مسئلہ حل کر دیا۔ میری قطر والی بھابی کی فرمائش تھی کہ اس کی طرف سے اس کی دونوں بہنوں کی شادی پر گفٹ میں ''روپ جیولرز'' کے بنے کنگن دیئے جائیں۔ وہ خود بیٹے کے کانووکیشن میں شریک ہونے بھائی کے ساتھ کینیڈا جا رہی ہیں۔ میں کل صبح تک تم کو رقم کا چیک بھجوا دوں گی...... انشاءاللہ۔''

انہوں نے کال سے فارغ ہو کر اپنا رخ موڑا تو سکندر کو سامنے دیکھ کر حیران ہو گئیں۔ ''میرا سیل یہاں رہ گیا ہے آپا۔'' سپاٹ سی آواز میں کہتے ہوئے اس کا چہرہ بھی سپاٹ ہی لگ رہا تھا۔ سائرہ آپا اس کی اچانک خاموش آمد پر کچھ خفت محسوس کر رہی تھیں۔ کہیں فون کی باتیں نہ سن لی ہوں اس نے......انہوں نے میز پر رکھا سیل اٹھا کر اسے تھماتے ہوئے کریدتی نظر ڈالی مگر کچھ اندازہ نہ لگا پائیں اور وہ ایک بار پھر جانے کیلئے مڑ گیا ناہموار اور شکستہ چال کیساتھ۔ ان کے دل کو لمحہ بھر کو جیسے کسی نے مسل ڈالا لیکن اپنے ذہن کو بھائی کی حالت سے ہٹا کر بیٹے کے بارے میں سوچنے لگیں جو کچھ ماہ بعد کینیڈا جا رہا تھا ان کے بھتیجے نے ہی یونیورسٹی ایڈمیشن سے لے کر رہائش کے انتظامات تک میں بہت تعاون کیا تھا۔ پڑھائی کے دوران اسے اچھی جاب بھی مل گئی تھی۔ اس لیے اس کے ساتھ اچھے بلکہ بہت اچھے مراسم رکھنا سائرہ کی ضرورت تھی۔ اب وہ کیسے اس بھابی کا کہا ٹال دیتیں یا معذرت پیش کرتیں جس کے بیٹے سے ان کی اولاد کے سنہری مستقبل کا راستہ سہل ہو سکتا تھا۔

اللہ میرے بھائی کے لیے کچھ بندوبست کر ہی دے گا۔ ضمیر کی سرزنش سے گھبرا کر انہوں نے سارے معاملے سے خود کو جدا کر کے مطمئن ہونا چاہا اور پھر ہو بھی گئیں۔ ''لو مٹھائی کا ڈبہ بھی چھوڑ گیا، ایسی بھی کیا پریشانی!!!'' گھنٹہ بھر بعد ان کی نگاہ میز پر رکھے ڈبے پر پڑی...... کھوئے کی مٹھائی ہے...... سڑ جائے گی بنا فریج کے...... قسمت میں ہی نہ ہو گی اس کے ورنہ میں تو بڑے شوق سے لائی تھی۔'' بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے کام والی لڑکی کو آواز دی کہ وہ اس کو لے جائے۔

اگلے دو دن بعد ان کے دیور اور دیورانی نے اپنے نئے گھر کی خوشی میں درس قرآن اور دعوت رکھی تھی۔ وہاں شریک ہونے کیلئے ان کو لباس اور زیور کی فکر تھی۔ دیورانی زیور بڑا عمدہ پہنتی تھیں کہ روپ جیولرز ان کے باپ چچا کا ہی تھا اور وہ والدین کی اکلوتی اولاد، سائرہ کو اکثر ہی اپنی دیورانی پر خوب رشک آتا تھا۔ اتنی مہنگائی کے وقت میں بھی سونا تو اس طرح پہنتی ہے جیسے تانبا...... پورا ہفتہ اسی ذہنی مصروفیت سے فارغ وہ اس وقت ہوئیں جب چھٹی والے دن کی شام دیور کے نئے گھر سے واپس آ کر وہ اپنے میاں کے ساتھ کھانے کے ذائقے کی تعریف کر رہی تھیں۔ آئس کریم کا ذکر آتے ہی انہیں سکندر کا دھیان آیا اور پھر اس کی پریشانی، ابھی انہوں نے میاں سے ذکر کرنے کا سوچا ہی تھا کہ ان کے موبائل پر کال آنے لگی اور وہ ادھر متوجہ ہو گئے۔ ان کے لہجے اور گفتگو سے سائرہ کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ تیرہ سالہ اسماء بھی جو اس وقت وہاں آئی تھی، چونک گئی تھی۔ اس نے اشارے سے ماں سے کچھ سوال کیا۔ ''ابو کیا بات کر

رہے ہیں؟؟'' سائرہ نے کندھے ہلا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا چند لمحہ وہ کھڑی رہی اور پھر وہاں سے ہٹ گئی۔ گفتگو میں واضح طور پر پریشانی تھی۔شاید کوئی ڈاکہ وغیرہ......انہوں نے اندازہ لگایا۔

''کمال کا فون تھا!''فون سے فارغ ہوکر سائرہ آپا کے میاں جمال نے بیوی کی سوالیہ نظروں کو مختصر جواب دیا۔ سائرہ آپا نے میاں کی اضطرابی حرکات وسکنات کو چند لمحے دیکھا۔''چلو ہمیں کمال کے ہاں جانا ہے۔'' جمال نے اچانک سائرہ کو چلنے کا کہہ کر الجھا دیا تھا۔

''ہمارے گھر سے نکلتے ہی زبردست ڈاکے کی واردات ہوئی ہے کمال کے گھر...... گارڈ کو مار کر گھر میں داخل ہوئے تھے۔ بھابی کے بھی گولیاں لگی ہیں آئی سی یو میں لے گئے ہیں انہیں......'' تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے جمال کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔ کتنی بار ان کی گاڑی حادثہ سے دوچار ہوتے ہوئے بچی...... جب وہ ہسپتال پہنچے تو دو گھنٹہ قبل کے دیکھے خوش باش، خوش ادا اور خوش لباس لوگوں کے چہرے خوف اور دہشت سے نچڑے سے لگ رہے تھے۔ دیورانی کی بیٹی صومیہ کے چہرے پر تھپڑ کا واضح نشان تھا۔ ذرا سی مزاحمت پر اور لوگوں کو بھی سزا دی گئی تھی۔ ماں نے بڑی جرات دکھا کر نگاہ بچتے ہی سیل فون استعمال کر کے مدد لینی چاہی تھی تو ان پر فائرنگ کر دی گئی۔ سائرہ آپا نے بھی اپنے اندر کپکپی اترتی محسوس کی۔ پستہ رنگ کے دھیمے شیڈز والے سوٹ کے ساتھ پروقار سی جیولری پہنے میمونہ کو سب ہی نے سراہا تھا۔ اس نے بڑے چاؤ سے میکے کی طرف سے تحفے میں ملے کانوں کے ٹاپس اور انگوٹھی بھی سب کو دکھائی تھی۔ چونکہ وہ میکہ اور سسرال کی دعوت جدا کرنے کے حق میں تھی۔ کسی نے مذاقاً یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ''اب میکہ کی دعوت میں نیلے رنگ کا سوٹ پہننا کہ میاں بیوی ہم رنگ کپڑوں میں بھی اچھے لگتے ہیں تو میمونہ بھرپور مسکرا رہی تھی۔''میرے پاس آج کل نیلی نہیں سیاہ رنگ میں نئے اسٹائل کی چوڑیاں ہیں۔ سوٹ بھی سیاہ ہی پہنوں گی۔'' لہجہ تو سادہ تھا لیکن نیت میں فخر ہی فخر تھا۔ سو سب نے ہی رشک سے دیکھا۔ جس کی نگاہ میں رشک نہ تھا وہاں حسرت تھی یا پھر جلن، عموماً انسان نعمتوں کا استعمال اعتراف نعمت کے بجائے اظہار فخر کے لیے ہی کرتا ہے چاہے بظاہر زبان سے کتنا ہی عجز ظاہر کرتا ہو۔ ایسے میں کتنے ہی دلوں میں فاسد خیالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کے اثرات بہرحال اس پر آتے ہی ہیں...... بالواسطہ یا بلاواسطہ......!

صرف کچھ گھنٹوں قبل ہی تو وہ میمونہ کے ہاں ایک بھرپور اچھا وقت گزار کر اپنی فیملی کے ساتھ لوٹی تھیں اور اب وہی دلکش صورت شاید موت کے قدموں کی چاپ سن رہی تھی۔ انہوں نے سہمی پھٹی نگاہ سے دیور کمال کو دیکھا جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ایسے میں ان کے پرس میں رکھا سیل بجا تو انہوں نے غائب دماغی سے اس کو ریسیو کیا۔

آپا میرا ڈیبہ......'' دوسری طرف سکندر تھا۔ انہوں نے اگلے ہی لمحے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر کہا کہ وہ مصروف ہیں، بات بعد میں کریں گی......سیکنڈ کی خاموشی کے بعد جلد سکندر نے فون منقطع کر دیا۔

اگلے پندرہ دن تک ان کی سکندر سے بات نہ ہو پائی......مومی کی حالت خطرے سے باہر نہ آنے تک وہ پابندی سے دیور کمال کے گھر کی خبر گیری کرتی رہیں مومنہ کی دونوں بیٹیاں صومیہ اور نوبیا کی تسلی کیلئے وہ ہر وقت حاضر رہتیں۔ بچیوں کے نانا نانی خود غم سے ادھ موئے ہو رہے تھے وہ کیا بچوں کو سنبھالتے۔ سائرہ آپا نے خوب خوب وقت نبھایا۔ ویسے تو ان کی دونوں نندوں اور جیٹھ نے بھی بھرپور تعاون کیا تھا۔ کمال اور کمال کی سسرال دونوں کے ساتھ مراسم رکھنا سب کے لیے مفید ہی تھا۔ اور سب ہی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے ایسے میں سائرہ آپا کو معاشرے میں تنکے کی سی حیثیت رکھنے والا بھائی بھول بھی گیا تو کوئی عجب نہ تھا۔

ایک شام جب وہ ہسپتال سے مومی کی عیادت سے فارغ ہو کر لوٹیں تو بے اختیار ان کو سکندر کا دھیان آ گیا۔ اپنا فون اٹھا کر انہوں نے بھائی سے رابطہ کرنا چاہا اگلی جانب فون بزی ہونے کا پیغام وصول ہو رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد بھی جب یہ ہی پیغام ملا تو

انہوں نے حیرانی اور کوفت کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ بات کرنے کا ارادہ مؤخر کر دیا۔

کچھ دیر بعد سکندر کا خود فون آ گیا۔ ''سوری آپا کسی پارٹی کا فون تھا۔ پہلی بار کسی بڑی تقریب کیلئے آئس کریم کا آرڈر ملا ہے۔'' سکندر کی آواز میں بہت تھکان لگی حالانکہ بات وہ خوشگوار بتا رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے آپا سے ان کی دیورانی کی تازہ ترین کیفیت سے متعلق استفسار کیا تو وہ چونک گئیں۔

''تمہیں کس نے بتایا؟؟''

''آپا اگر میں آپ لوگوں کے درمیان نہیں ہوں تو اس کا یہ مطلب کب ہے کہ مجھے کچھ بھی علم نہ ہو۔ ان کے والد سے ملاقات ہوئی تھی۔''

''کیا......! کیا تم میری دیورانی کے باپ سے ملنے گئے تھے؟'' سائرہ آپا نے اس کی بات کاٹ کر خاصے ترش لہجے میں پوچھا تو اس نے لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد فون بند کر دیا۔

انہوں نے خشمگیں نظروں سے سیل کی اسکرین دیکھی اور خود فون ملا لیا ان کو سکندر کی بات سے بے چینی لگ گئی تھی۔ بیل جاتی رہی مگر اس نے فون ریسیو نہ کیا یہ میری بنائی عزت کا جنازہ نکال دے گا نہ جانے کیوں ملا تھا مومی کے ڈیڈی سے۔ بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے پھر رابطہ کی کوشش کی۔ اب کے اس نے فوراً ریسیو کر لیا۔

''آپا آپ کے سادہ سے بے معنی سوال کے پیچھے سوال کو میں سمجھ چکا ہوں۔ میں نے عزت نفس کا سودا کر کے محض دو لاکھ کی رقم بطور قرض آپ جیسے کئی صاحب ثروت لوگوں سے مانگی ضرور تھی۔ مگر ان میں سے کوئی بھی آپ کی دیورانی کے والد محترم نہیں تھے۔ بہتر ہے آئندہ ایسے سوالات نہ کریں جن سے میری رہی سہی اوقات بھی نہ رہے۔ میں ابھی اس مقام پر نہیں ہوں جہاں کسی بھی قسم کا رابطہ محض مستقبل کے فوائد کے تول مول پر ہوتا ہے۔''

فون بند کرنے سے پہلے اس نے جملہ خاصی تلخی سے کہا تھا جس نے ان کا موڈ خراب کر دیا۔ ''اچھے برے حالات انسانوں پر ہی آتے ہیں۔ اس طرح کوئی کریلا نیم چڑھا نہیں بنتا۔'' سائرہ آپا نے بھائی پر دل میں تبصرہ کیا اور سکون بھی محسوس کیا کہ وہ اتنی عقل ضرور رکھتا ہے کہ مومی کے والد سے نہیں ملا ورنہ ان کی کیا عزت رہ جاتی۔

''کمال اور میمونہ کے بچے کیسے کمہلا گئے ہیں۔'' ان کی ذہنی رو دوسرے رخ پر چلی گئی۔ ہمدردی کی لہریں ان کے اندر اٹھنے لگیں۔ گھر کا نظام کیسا ابتر ہے اور بے چارہ کمال اتنے ٹینس حالات میں کتنے طریقے سے ہے۔ انہوں نے بڑی بے انصافی سے بھائی اور دیور کا موازنہ نہ کیا۔ دکھ پہنچنے سے زیادہ دکھ میں ساتھ چھوڑ دینے سے انسانوں میں نمایاں تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ تکلیف، تکلیف نہیں رہتی اگر اردگرد مہربان رویے ہوں۔ سکندر پر جو کچھ بیت رہا تھا وہ کمال نہیں سہہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ جذباتی سہارے تھے، مادی وسائل تھے۔ سکندر کے ساتھ جو سہارا دینے موجود ہونے چاہیے تھے وہ سب ہی کہیں اور مصروف تھے۔ ایسے میں دونوں کرداروں کی کیفیت یکساں ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اس بات کو محسوس نہیں کر رہی تھیں۔

رات گئے اپنی آئس کریم کی دکان کا شٹر گراتے سکندر کا دل خاصا بوجھل تھا۔ حالانکہ بظاہر کچھ بھی بات دردسری کی نہ تھی۔ دھیمے قدموں سے اس نے اپنے گھر کے راستہ کی طرف رخ کیا ہی تھا کہ عقب سے ابھرنے والی سرد آواز نے اس کو لرزا دیا۔

''جو کچھ ہے نکال دو۔'' اس نے مڑ کر دیکھا تو بے رحم نظروں سے دیکھتے دو چہرے سامنے تھے۔ ایک نے ریوالور کی نال سے اس کے کندھے کو تھپتھپایا تو سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔

''کچھ...... کچھ نہیں ہے میرے پاس!! اس نے اپنی جیبوں کو ان کے سامنے الٹ دیا۔ موبائل کھٹ سے نیچے گرا، جسے دونوں میں سے ایک نے بڑے اطمینان سے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔

''چل دکان کا تالہ کھول'' ان کی بات نے جہاں اس کو چونکایا وہیں وہ لرز گیا۔ اس میں پندرہ ہزار رکھے تھے۔ اس کی محنت کی کمائی، خون پسینہ کی آمدنی! ایسے کیسے ان کے حوالے کر دوں؟ بس اس نے ذرا سی کسماہٹ ہی تو کی تھی کہ کتنے ہی

انگارے اسے اپنے جسم میں اترتے محسوس ہوئے۔آنکھوں کے آگے اترتی دھند میں اسے آسمان سے اترتا ترازو صاف نظر آرہا تھا۔نہ جانے کون تھا جو اس کو سنبھالے تھا۔تکلیف دہ سسکاری ابھری مگر اس اندھیری سڑک پر کوئی نہ تھا جو اس کی حالت دیکھتا وہ مدد کیلئے کسی کو پکارنا چاہتا تھا۔مگر دکھائی دیتے ترازو کے منظر نے اس کی آواز بالکل سلب کر لی تھی۔ترازو کے درمیان میں اس کا نام لکھا تھا۔وہ یہ صاف دیکھ سکتا تھا، دونوں پلڑوں میں بڑے چھوٹے کتنے ہی پیکٹ رکھے تھے اس نے خوفزدہ نظروں سے اس پیکٹ کو دیکھا جس سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ان شعلوں کی تپش اس تک پہنچ رہی تھی۔اس نے منہ کھول کر چلانا چاہا۔''میں مجبور تھا۔ مجھے بس دو لاکھ چاہیے تھے،صرف دو لاکھ کیلئے میں نے کرمانی کو کمال کا بتایا تھا۔''اس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور زبان نہ جانے کیا کیا اعتراف کر رہی تھی۔میزان کے پلڑے اوپر نیچے ہو رہے تھے۔وہ عجیب بے چینی کے عالم میں تھا۔

تو یہ تھا سکندر تمہارا انجام،اس نے واضح طور پر یہ آواز سنی تو درد کی کاٹ دار لہر سے اس کے حلق سے بلند چیخ برآمد ہوئی۔اوندھے گرے ہوئے وجود کے ساتھ اس نے زمین پر گھسٹنا شروع کیا اور پھر نہ جانے وقت کی کس مقدار کے بعد مہربان سی خوشبو اس کے اگرد گرد پھیل گئی۔

اماں جی! میں مجبور تھا مت ماریے......اور اس نے چہرہ زمین سے ٹکا دیا۔

''کیا کر رہا ہے پولیس کیس ہے یہ...... کیوں مصیبت میں پھنسا رہا ہے......سب کو۔''

قریب سے گزرتی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اس پر پڑیں اور بھنبھناہٹ کی آوازیں سکندر کے کانوں میں اتریں۔دو مضبوط بازوؤں نے اس کو سیدھا کیا۔ہلتے لب کچھ کہہ رہے تھے۔کچھ نہ سمجھ آیا صرف ''ارحمنی'' سنائی دیا۔

اوہ یہ تو سکندر ہے......خالہ عائشہ کا بیٹا......اس کو گاڑی میں ڈال کر ہسپتال کی طرف جاتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا لڑکا بولا۔میں سوچ رہا تھا کہ کیوں اس کی شکل دیکھی بھالی لگ رہی ہے۔ ہمارے مفلس ترین دور میں ہماری مدد کیلئے اللہ کی طرف سے بھیجا فرشتہ خالہ عائشہ......!! اور یہ ان کا بیٹا! کیسے چھوڑ دوں میں اس کو...... کیسے!!!

آواز میں سکندر کیلئے ڈھیروں فکرمندی تھی۔

''ارحمنی'' سکندر کے بے آواز لب پھر تھرتھرائے...... گاڑی میں بیٹھے نفوس نے مڑ کر زخموں سے چور جسم کو دیکھا......ہسپتال آ چکا تھا اور وہ اس کیلئے ہر امتحان سہنے کو تیار تھے......ارحمنی مولا یا......!!

☆☆☆☆

اِک ذرا حرمِ نبوی تک

مدینہ چیک پوسٹ سے اپنی بلڈنگ ابراج حکیم نمبر۲ تک پہنچنے میں آدھا گھنٹہ صرف ہوا...... ساری تھکن 'نیند' مشقتیں ایک طرف ......ایک ہی خواہش تھی ، یا الٰہی! صبح فجر کی نماز مسجد نبوی میں مل جائے ......کیا ہی اچھا ہوا کہ جمعہ کو علی الصبح مدینہ میں آمد اور اب پہلی نماز مسجد نبوی میں ......سامان بلڈنگ میں رکھ کر الٹے پاؤں باہر بھاگے ۔ لمبی چوڑی سڑکیں، بے پناہ ٹریفک ......سڑک پر پہنچے تو گاڑیاں دور سے ہی ہمیں دیکھ کر رک گئیں ۔ اچانک ہی مجھے اپنی ''گرائیں'' ثمینہ امجد (مقیم طائف، میری بہت پیاری ہونہار شاگرد امیمہ کی والدہ) کا دو دن قبل کہا ہوا فقرہ یاد آیا...... میں نے جدہ سے آتے ہوئے عربوں کی مہمان نوازی کا ذکر کیا تو کہا تھا......''ابھی تو قانتہ آپ مدینہ جائیں گی وہاں آپ کو مکہ اور مدینہ کے رویوں میں واضح فرق نظر آئے گا......''

یہ مدینہ میں داخل ہوتے ہی پہلا واضح فرق تھا۔ واقعی مکہ کے تین دنوں میں سڑک کے کنارے کافی دیر انتظار میں رہتے پھر جب زائرین کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو جاتی تھی تو گاڑیاں رکتی تھی۔

ارے ہم تو ابھی دور ہیں! یہ دوسری خوشگوار حیرت تھی، یہی مہمان نوازی تھی یہی محاسن اخلاق ہوں گے جس کی وجہ سے میرے نبیؐ ان کے گرویدہ ہو گئے ہوں گے...... دوڑتے بھاگتے اشتیاق کی رننگ کمنٹری بھی جاری تھی......

بس وہ سامنے جو سڑک ہے اس سے دس منٹ کے فاصلے پر مسجد نبوی ہے۔

مدینہ! میں یہاں بھی پریشان تو ہوئی مگر جدہ اور پھر مکہ کے حالات وواقعات نے مجھے کچھ نہ کچھ سمجھدار بنا دیا تھا...... پھر بھی پاگل دل، مچل مچل کر وہی طیبہ مانگ رہا تھا...... کچی عمارات، کھجوروں کے جھنڈ، صاف ستھری گلیاں، لیکن وہی بلند و بالا عمارات ہی غالب تھیں ......ثمینہ کا کہا اک فقرہ جو اس نے میری ذہنی کیفیت کو نارمل سطح پر لانے کے لیے کہا تھا مجھے بہت اچھا لگا۔

''عربوں نے زمین سے کمایا اور زمین پر ہی لگا یا ہے......''

واقعی......انھی سوچوں میں اشتیاق نے متوجہ کیا۔

بس یہ مینار ہیں مسجد نبوی کے......ہم پہنچنے والے ہیں۔ بلند و بالا مینار...... پُرشکوہ......دو جہانوں کی روشنیاں سمیٹے مسجد نبوی میرے سامنے تھی۔

کچی پکی اینٹوں اور کھجور کی صفوں والی مسجد نبوی کی بجائے دنیا کی حسین ترین مسجد میرے سامنے تھی!!

یہ چھتریاں دیکھو کتنی زبردست ہیں، انھوں نے کہا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے مجھے دنیا داری اور بڑی بڑی بلڈنگز سے خوف آتا ہے...... چودہ سو سال قبل کی مسجد نبوی میرے دل و دماغ میں اور آج کی مسجد نبوی میرے سامنے تھی......!!

ارے یہ تو دنیا جہاں کے قیمتی میٹریل سے بنی ہے، کسی کا فقرہ سنائی دیا......

ہاں واقعی، جس نے دنیا کو آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا تھا...... مرض وصال میں سات دینار گھر سے کل اثاثے کے طور پر برآمد ہوئے تو فوراً تقسیم کر دیے اور فرمایا۔

''عائشہؓ! میں اللہ سے اس حال میں نہیں ملنا چاہتا کہ میرے گھر میں دنیا کا سامان ہو......'' آج اس کے قدموں میں کروڑوں ڈالر سے بنی عمارت ہے! دنیا تو سایہ ہے، دین مانگو، دنیا تو مل ہی جاتی ہے ......جبکہ دنیا مانگنے پر ملتی اتنی ہی ہے جتنا مقدر میں لکھا ہوا اور دین بھی

جاتا رہتا ہے۔

اتنے میں اذان کی آواز سنائی دی ...... یہ عورتوں کا دروازہ ہے، انھوں نے مجھے اشارے سے بتایا، یہیں آجانا۔

السلام علیکم باجی ......ایک دم شاہدہ میری حج ساتھی نظر آ گئی۔
ہم دونوں جائے نماز پکڑے بھاگتی دوڑتی جگہ ڈھونڈ رہی تھیں کہ ایک خاتون نے پکارا......ہم قریب گئے تو پتہ چلا جوڑوں کے درد کی مریضہ ہیں چل نہیں سکتیں اور یہاں منتظمین ''حرام حرام'' کہہ کر اٹھا رہے ہیں کہ یہ مردانہ حصہ ہے......ہم دونوں انھیں سہارا دے کر عورتوں والے حصے میں لے گئیں جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ان خاتون کو جائے نماز بچھا کر وہاں بٹھانے میں جتنی دیر لگی اتنی دیر میں نماز کے لیے صفیں بنانے کی تلقین آ گئی۔

جلدی جلدی جائے نماز بچھا کر دو سنتیں ادا کرنے کے لیے ہاتھ اٹھانے لگی تھی کہ جانی پہچانی آواز آئی۔

''باجی قانتہ؟''

چونک کر دیکھا۔''ارے باجی سعیدہ ...... !'' بے اختیار وہ میرے اور میں ان کے گلے لگ کر رو پڑیں ...... یہ کوئی سالوں بعد کی نہیں محض تین دن کی جدائی کے بعد کی ملاقات تھی ...... لیکن اس ملاقات سے جس طرح ہم پہلے روئیں بعد میں خوب ہنسیں اس کا خاص پس منظر تھا...... باجی، سعیدہ ہماری (گوجرہ سے) بہت پیاری بہن ہیں ......گھریلو اور جماعتی تعلقات بھی مستحکم ہیں ......ان کو بہت سال پہلے خواب آیا تھا جسے وہ اپنے گھر والوں کے علاوہ مجھے بھی پاکستان میں سنا چکی تھیں کہ مسجد نبوی میں فجر کی نماز ادا کرتے ہوئے انھوں نے مجھے اپنے دائیں جانب دیکھا ہے...... جب ہم نے درخواست دی تھی تو مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ وہ بھی امسال حج کا ارادہ رکھتی ہیں۔ وہ تو بہت بعد میں پتہ چلا، خواب دہرایا گیا، ایئرپورٹ پر بھی خواب کی تکرار ہوئی...... یہ اسی خواب کی تعبیر تھی جس پر ہمارا رونے اور ہنسنے کا پورا پورا حق تھا۔ سب دیکھنے والیاں بھی ہمارے ملنے پر مسکرا رہی تھیں۔
شکر اس ہستی کا جس نے خواب کے بعد ہمیں اپنے نبیؐ کے گھر میں بھی ملایا، وللہ الحمد۔

خیر نماز ادا کی۔ چونکہ سامان کمرے میں رکھنا تھا، ساری رات جاگتے گزاری تھی اور کھایا پیا بھی نہیں تھا لہٰذا ''پہلے پیٹ پوجا تے فیر کم دوجا'' پر عمل کرتے ہوئے۔ مقررہ گیٹ تک پہنچنا چاہا تو گیٹ ملا نہ شاہدہ کا ساتھ رہا۔

بہت پریشانی ہوئی۔ اللہ جی! اب کیا کروں ...... اک باب جبریل کا نام سامنے تھا سالگا اسی کو سہارا بنا کر اشتیاق کو فون پر بتایا...... چند منٹوں میں وہ سامنے تھے......ان کے ساتھ پھر سڑک پر پہنچی ...... ابھی مسجد نبوی کے اندر جانا ممکن نہیں تھا سوچا یہی تھا کہ نہا دھو کر آؤں گی......اس لیے راستے میں ناشتہ لیا اور بلڈنگ پہنچے۔

یہاں پر فاصلہ، مکہ کی نسبت کم تھا لیکن سہولت یہ تھی کہ سیدھی سڑکیں تھیں مکہ کی طرح اترائی چڑھائی کے معرکے نہیں تھے ...... بلڈنگ پر کارڈ لیے، چابی اٹھائی، لفٹ سے چھٹی منزل پر پہنچے۔

یہ کیا؟ بڑا سا کمرہ جس میں چھ سنگل بیڈ تھے......
یہ مردوں اور عورتوں کا مشترکہ کمرہ ہے، انھوں نے دھماکہ کیا۔

یہ اچھی بات ہے اللہ جی! مکہ میں حرم کے اندر عورت مرد اکٹھے طواف کرتے ہیں لیکن کمرے الگ الگ تھے۔ یہاں مسجد نبوی میں عورتوں اور مردوں کو بالکل الگ رکھا ہے تو کمرہ مشترکہ دے دیا...... اعصاب پر جھنجھلاہٹ سی سوار ہوگئی۔ میری نیند بھک سے اڑ گئی۔ مشترکہ کمرے میں سونا مشکل لگ رہا تھا۔
سامنے والے کمرے میں موجود خواتین سے بات کی کہ آپ ہمارے کمرے میں آ جائیں، مردوں کو دوسرا کمرہ دے دیتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے مردوں سے مشورہ کے بغیر ''ہاں'' کرنے سے انکار کر دیا......علیم صاحب اور عبدالغنی صاحب ہمارے گروپ کے دونوں مرد اپنی بیویوں کے ساتھ کمرے میں آ چکے تھے۔ میں بہت پریشانی کے عالم میں کمبل لپیٹ کر دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گئی...... اے سی خراب تھا اور مدینہ کی متوقع ٹھنڈ کا سن کر جو کاٹن کا سوٹ پہنا تھا اس کی اور اونی کمبل کی وجہ سے بے حد گرمی لگ رہی تھی۔

اب تو کھانا پینا، سونا، پڑھنا، عبادت کرنا سب ہی ناممکن ہے...... کچھ دیر کے بعد سامنے والے کمرے کے مرد بھی آ گئے جن میں سے لال داڑھی والے بابا جی جو پاٹ دار آواز میں بولتے تھے اور بس بولتے ہی رہتے تھے، ان سے اشتیاق نے مسئلہ بیان کیا۔ انھوں نے ڈپلومیسی سے کام لیا اور اپنی ''زنانیوں'' سے ''گل بات'' کے بعد مہلت مانگی۔

یہ اور بات ہے اگلے آٹھ دن ان کی اس موضوع پر زنانیوں سے بات ہی نہ ہو سکی۔ البتہ ایک دن کچن میں مجھے اکیلا دیکھ کر دروازے پر آ کر رک گئے اور بولے۔

''حاجن توں میرے کوں پردہ کرنی ایں، تینوں نئیں پتہ اللہ پاک فرماندے نیں جدوں اک حاجی، حاجن نوں دیکھدا اے تے اوہنوں حج دا ثواب مل دا اے تے جدوں اک حاجن حاجی نوں ویکھدی اے اوہنوں عمرے دا ثواب ملدا اے، تے فیروی تو میرے کولوں منہ لکونی ایں۔''

(تم مجھ سے پردہ کرتی ہو تمھیں نہیں پتہ اللہ پاک فرماتے ہیں جب اک حاجی، حاجن (متوقع) کو دیکھتا ہے تو اسے حج کا اور جب حاجن، حاجی کو دیکھتی ہے تو اسے عمرہ کا ثواب ملتا ہے۔)

الگ الگ کمروں کی ساری آسیں امیدیں دم توڑ گئیں اور دوبارہ مسجد نبوی کا پروگرام بنا لیا...... نیند تو آتی نہیں یہاں...... وہیں چلتے ہیں......۔

۞۞۞

تیسری صاحبزادی اُم کلثومؓ بنت محمد ﷺ

ام کلثومؓ نام تھا، رسول اللہؐ کی تیسری صاحبزادی تھیں۔ والدہ خدیجۃ الکبریٰ تھیں۔ آپؓ کی ولادت بعثت نبوی سے چھ سال قبل ہوئی۔

نکاح

حضرت محمدؐ نے حضرت رقیہؓ کا نکاح ابولہب کے بیٹے عتبہ سے اور حضرت ام کلثومؓ کا عقد ابولہب کے دوسرے بیٹے عتیبہ سے قبل از اسلام کر دیا تھا۔ جب نبی کریمؐ بعثت نبوت پر فائز ہوئے تو ابولہب اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا۔ تب اس کی مذمت میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ لہب نازل فرمائی تو ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ

''میری زندگی، میرا اٹھنا بیٹھنا تم لوگوں میں حرام ہے اگر تم نے اس (رسول اللہ) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دی۔''

اس کے کہنے پر عتبہ نے حضرت رقیہؓ کو اور عتیبہ نے حضرت ام کلثومؓ کو طلاق دے دی۔ اس طلاق میں ابولہب کی بیوی ام جمیل کی بھی رضامندی شامل تھی۔ ابھی دونوں بہنوں کی رخصتی نہیں ہوئی تھی جب طلاق بھی ہوگئی۔

عتیبہ نے تو حضرت ام کلثومؓ کو صرف طلاق دینے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ سرورِ عالمؐ کے ساتھ سخت گستاخی اور ناشائستگی سے بھی پیش آیا۔ حضورؐ کی شان میں برے اور ہتک آمیز کلمات استعمال کیے۔ ان بدکلامیوں سے آنحضرتؐ کے قلب مبارک کو ٹھیس پہنچی، چہرۂ اقدس فرطِ جلال سے تمتما اٹھا اور آپؐ کی زبان مبارک سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے۔

''اے اللہ اپنے دو شیروں میں سے ایک شیر کو اس شقی پر مسلط کر دے۔''

حضورؐ کی زبان سے اس بددعا کا سننا تھا کہ عتیبہ کا چہرہ فرطِ خوف سے زرد پڑ گیا۔ ابولہب بھی موجود تھا اس پر بھی ڈر کے مارے لرزہ طاری ہوگیا۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد ابولہب اپنے لڑکے عتیبہ کے ساتھ شام کے سفر پر جا رہا تھا۔ راستے میں ایک مقام پر اچانک عتیبہ کو حضورؐ کی بددعا یاد آ گئی اور اس پر عجیب خوف و دہشت کا عالم طاری ہو گیا۔ اس کے ہمراہیوں نے اسے تسلی و تشفی دی۔ اور اس کے سکون و اطمینان کے لیے اس کے گرد مال و اسباب کی ایک دیوار سی کھڑی کر دی اور اس کی نگہبانی کرنے لگے۔ تقریباً آدھی رات گزری تھی کہ اچانک ایک طرف سے ایک شیر آیا اور آن واحد میں عتیبہ کا کام تمام کر کے پھر جنگل میں غائب ہوگیا۔ جو لوگ اس کی پہرے داری کر رہے تھے وہ خوف اور حیرت سے یہ دہشت ناک منظر دیکھتے رہ گئے اور کوئی اسے نہ بچا سکا۔ (دلائل نبوت)

حضرت ام کلثومؓ شعب ابی طالب میں

۷ نبوی کا زمانہ رسول اللہؐ اور ان کے اہل بیت کے لیے نہایت تنگی ترشی اور مصائب و آلام کا زمانہ تھا۔ اسلام کے نام لیواؤں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی تھی۔ ایک مصیبت ختم ہوتی تو دوسری شروع ہو جاتی۔

اسی زمانے میں قریش نے نبی کریمؐ، آپؐ کے ساتھیوں اور خاندان والوں سے قطع تعلق کر لیا۔ تکالیف و مصائب کا یہ دور تین سال پر محیط ہے۔ اس دور میں قریش نے ایک معاہدہ لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا جس کے تحت مکے والے نبی کریمؐ، ان کے ساتھیوں اور خاندان والوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھیں گے، نہ ان کے ہاتھ کوئی چیز

بچیں گے نہ ہی ان سے کچھ خریدیں گے۔

۷ نبوی کو حضورؐ کو اپنے اعزا و اقرباء اور ساتھیوں سمیت شعب ابی طالب نامی ایک تنگ سی گھاٹی میں پناہ لینی پڑی۔ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے پورے تین سال تک صبر و استقلال کے ساتھ ان حوصلہ آزما آلام و مصائب کو برداشت کیا۔ ان میں آپؐ کے خاندان کے علاوہ آپؐ کے گھر والے جن میں حضرت خدیجہؓ اور آپؐ کی صاحبزادیاں ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ بھی تھیں۔ ان جیسے اور بھی بہت سے بچے بچیاں تھے بلکہ کئی تو بہت ہی چھوٹے تھے۔ یہاں انھیں کئی کئی روز تک بھوکے پیاسے رہنا پڑتا۔ مکہ کے چند رحم دل لوگ انھیں چھپ چھپا کر کھانے پینے کی اشیاء دے جاتے مگر سنگدل قریش کے دل نہ پسیجے۔ حتیٰ کہ جب چھوٹے بچے بھوک سے بیتاب ہو کر رونے لگتے تب بھی شقی القلب قریش کے دل نرم نہ ہوتے۔ آخر انہی کافروں میں سے چند نیک اور رحم دل لوگوں نے کعبہ کے دروازے پر لٹکا ہوا بنو ہاشم کا معاہدہ چاک کر دیا اور مسلمانوں کو اس دردناک قید سے نجات دلائی۔

حضرت ام کلثومؓ اور ان کی بہنوں نے اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ تین سال کی قید کاٹی جس کے بعد حضرت خدیجہؓ کی صحت خراب ہو گئی۔ شعب ابی طالب سے نکلنے کے چند ہی مہینوں بعد ۱۰ نبوی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ ماں کی شفقت سے محروم ہو گئیں۔

ان کے چند دن کے بعد آپؐ کے چچا ابو طالب بھی چل بسے۔ آپؐ کے لیے یہ سال بڑے رنج و غم کا سال تھا۔ اس لیے تاریخ میں اسے ''عام الحزن'' کہا جاتا ہے۔

ان دونوں ہستیوں کا مکہ میں ایک خاص مقام تھا ان کے جیتے جی کفار کھلم کھلا مسلمانوں پر ظلم و ستم نہیں کر سکتے تھے۔ ان دونوں کی وفات کے ساتھ ہی آپؐ پر ہر طرف سے مصیبتوں کی یلغار شروع ہو گئی۔ یہ بہت سخت اور پر آشوب دور تھا۔ آپؐ کی ہمدم اور عزیز ترین رفیقۂ حیات کے جانے سے مشکلات بڑھ گئی تھیں۔ گھر سے باہر اسلام کی تبلیغ، مظلوم مسلمانوں کی تسلی و غم گساری اور گھر میں بچیوں کی نگہداشت، یہ سب کام حضورؐ کو ایک ساتھ کرنے پڑتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپؐ اکثر ملول رہتے۔ آپؐ کی طبیعت مبارک افسردہ رہتی۔ بن ماں کی بچیوں کو دیکھ کر آپؐ رنجیدہ ہو جاتے تو ایک صحابیہ حضرت خولہؓ بنت حکیم نے حضرت سودہؓ سے آپؐ کے نکاح ثانی کے لیے جنبانی کی اور یوں ۱۰ نبوی رمضان کے مہینے میں آپؐ کا نکاح حضرت سودہؓ سے ہو گیا جو ایک بیوہ تھیں۔ انھوں نے آپؐ کے گھر کا انتظام اچھی طرح سے سنبھال لیا اور گھر میں حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ کو حضرت سودہؓ کا ساتھ مل گیا۔

ہجرت

جب حضورؐ مدینہ کی طرف ہجرت فرما کر تشریف لے گئے تو اہل و عیال کو مکہ میں ہی چھوڑ گئے بعد میں حضرت زید بن حارثؓ کو بھیج کر حضرت سودہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ کو بھی مدینہ بلوا لیا۔

نکاح

حضرت عثمانؓ کو حضرت رقیہؓ سے بے حد محبت تھی اور یہ رشتہ محبت تادم آخر قائم رہا۔ حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد حضرت عثمانؓ آپ کے غم میں ہر وقت مضطرب و بے چین رہتے۔ ایک روز محمدؐ نے حضرت عثمانؓ کی یہ حالت دیکھ کر فرمایا۔ اے عثمانؓ میں تجھ کو غم و الم میں مبتلا پاتا ہوں اس کا کیا سبب ہے۔ حضرت عثمانؓ نے عرض کیا یا حضرت غمگین و پریشان نہ ہوں تو کیا کروں مجھ پر وہ مصیبت پڑی ہے جو کبھی کسی پر نہ پڑی ہوگی۔ حضورؐ کی صاحبزادی سے میرا جو رشتۂ قرابت تھا منقطع ہو گیا اب کیا چارہ ہے۔

ابھی ان کی گفتگو ختم نہ ہونے پائی تھی کہ رسول اللہؐ نے فرمایا، مجھے جبرائیلؑ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے یہ حکم پہنچایا ہے کہ میں اپنی بیٹی ام کلثومؓ کو اسی مہر پر جو رقیہؓ کا تھا تمھارے عقد میں دے دوں۔ (اسد الغابہ) چنانچہ آنحضرتؐ نے ربیع الاول ۲ ہجری میں حضرت ام کلثومؓ کا عقد حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ (طبقات)

نکاح کے دو ماہ بعد ۳ ہجری جمادی الآخر میں رخصتی عمل میں

آئی۔ آپؓ کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

حضرت ام کلثومؓ اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ اسلام لائیں۔ اپنی بہنوں کے ساتھ اس وقت بیعت کی جب اور عورتیں آنحضرتؐ کے شرفِ بیعت سے بہرہ اندوز ہوئیں۔ ایک روایت میں ہے جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا اسی زمانے میں حضرت عمر فاروقؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ بھی بیوہ ہوگئیں۔ ایک روز حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ تم میری بیٹی حفصہؓ سے عقد کرلو لیکن حضرت عثمانؓ نے تامل کیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ آپؓ نے بہت ناگواری محسوس کی۔ آپؓ وہاں سے اٹھے اور حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر پہنچے۔ ان سے بھی یہ رشتہ قبول کرنے کی پیشکش کی۔ حضرت ابوبکرؓ بھی کسی مصلحت کے تحت خاموش رہے اور کچھ جواب نہیں دیا۔ حضرت عمرؓ کو طیش بھی آیا اور رنج بھی ہوا اس لیے آپؓ وہاں سے اٹھ کر سیدھے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ کی خدمت میں حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے خشک برتاؤ کی شکایت پیش کی۔ حضورؐ مسکرائے اور فرمایا، عمرؓ میں نے تمھارے لیے عثمانؓ سے بہتر داماد اور عثمانؓ کے لیے حفصہؓ سے بہتر دلہن تجویز کرلی ہے۔ (بخاری)

حضور کے اس معنی خیز ارشاد سے حضرت عمرؓ کی پریشانی اور حزن و ملال یک لخت مسرت واطمینان سے بدل گیا۔

آنحضرتؐ نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ حضرت ام کلثومؓ کے نکاح کا فیصلہ فرمایا تھا وہیں حضرت عمرؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ سے بنفس نفیس خود رشتۂ زوجیت قائم کرنے کا فیصلہ فرمالیا تھا۔ حضرت عمرؓ کو حضورؐ کا فیصلہ سن کر ازحد مسرت ہوئی اور ان کا غم دور ہوگیا۔

حضرت عثمانؓ کو بارگاہِ نبوت سے دوبار دامادِ رسولؐ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا اس لیے آپؓ کو ذی النورین کا خطاب عطا ہوا جس کا مطلب ہے دو نور والے۔ (تاریخ ابن خلدون)

علمائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کے سوا دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں گزرا جس کے نکاح میں کسی نبی کی دو صاحبزادیاں آئی ہوں۔ (متفق علیہ) حضرت عثمان اس فضیلت میں اتنے ممتاز ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا صحابی رسولؐ اس میں آپؓ کا شریک نہیں۔

رخصتی کے وقت آپؐ نے اپنی چہیتی بیٹی سے فرمایا۔ ''جانِ پدر! آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے شوہر کی شکل وصورت آپ کے دادا ابراہیمؑ اور آپ کے باپ محمدؐ سے ملتی جلتی ہے۔ (طبقات ابن سعد)

شادی کے بعد حضرت ام کلثومؓ نے نہایت خوشگوار زندگی گزاری۔ وہ انتہائی شوہر پرست اور وفا شعار بیوی تھیں۔ ایک روز انھوں نے حضرت محمدؐ سے پوچھا کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی نظر میں ان کے شوہر حضرت عثمانؓ کا کیا مرتبہ ہے اور یہ بھی پوچھا کہ میرے شوہر عثمانؓ کا مرتبہ بلند ہے یا فاطمہؓ کے شوہر علیؓ کا؟ آپؐ نے نہایت حکمت سے اس سوال کا جواب دیا۔ آپؐ نے فرمایا بیٹی آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کے شوہر عثمانؓ ان لوگوں میں سے ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ اور اس کا رسولؐ ان سے محبت کرتے ہیں۔ پھر فرمایا میں نے جنت کی سیر کی تو وہاں آپ کے شوہر عثمانؓ کا مکان سب سے زیادہ وسیع اور بلند دیکھا کہ اتنا وسیع اور بلند مکان ہمارے کسی صحابی کا نہ تھا اور یہ مرتبہ ان کو اس لیے ملے گا کہ کچھ لوگ ان کے قتل پر آمادہ ہوں گے اور اس دن عثمان صبر وشکر سے کام لیں گے۔ (ازالۃ الخفاء)

حضرت ام کلثومؓ نہایت نیک مزاج، خوش اطوار، خوبصورت اور شیریں زبان تھیں۔ شوہر کی خدمت وفرمانبرداری دل و جان سے کرتیں۔ چھ سال سے زیادہ عرصہ تک حضرت عثمانؓ کے پاس رہیں لیکن باہمی اخلاص ومحبت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار بھی کسی شکر رنجی کی نوبت نہیں آئی۔

ابھی حضرت ام کلثومؓ کی عمر مبارک صرف ۳۲ برس کی ہوئی تھی کہ آپؓ بیمار پڑ گئیں۔ بہت علاج معالجہ کروایا مگر بے سود، کوئی فرق نہ پڑا آخرکار آپؓ نے ۹ ہجری شعبان کے مہینے میں وفات پائی۔ حضورؐ نے اپنی جگر گوشہ کے غسل کا انتظام خود فرمایا۔ حضرت ام عطیہؓ، حضرت اسماءؓ بنت عمیس، حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب اور لیلیٰؓ بنت قائف

نے آپؐ کو غسل دیا۔ آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ میری بیٹی کو سات بار غسل دو۔ غسل کے بعد حضورؐ رنج والم کے عالم میں دروازے کی اوٹ میں ٹیک لگائے کھڑے تھے کہ لیلیٰؓ بنت قائف آئیں اور کفن کا کپڑا مانگا۔ حضورؐ انھیں یکے بعد دیگرے کفن کا ایک ایک کپڑا دیتے گئے۔ آپؐ بیٹی کا کفن دیتے جاتے اور چشم مبارک سے آنسو گرتے جاتے تھے۔ (ابوداؤد)

حضرت محمدؐ نے خود نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ' حضرت ابوطلحہؓ، حضرت اسامہؓ بن زید اور حضرت فضلؓ بن عباس قبر میں اترے اور سیدہ کو جنت البقیع میں سپرد خاک کر دیا۔

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ جس وقت سیدہ ام کلثومؓ کو قبر میں اتارا گیا تو حضورؐ قبر کے پاس تشریف فرما تھے اور آپؐ کی آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا۔

دفن کے بعد آپؐ نے فرمایا، افسوس اب میرے پاس کوئی تیسری بیٹی غیر شادی شدہ نہیں رہی ورنہ میں اسے بھی عثمانؓ کے عقد میں دے دیتا۔ (اسدالغالبہ)

حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ اگر خدا مجھے چالیس بیٹیاں عطا فرماتا تب بھی میں یکے بعد دیگرے انھیں عثمان کے عقد میں دے دیتا۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک بھی باقی نہ رہتی۔ (ابن خلدون)

دوسری روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا اگر میری سولہ لڑکیاں ہوتیں تو میں سب لڑکیاں یکے بعد دیگرے حضرت عثمانؓ کے عقد میں دے دیتا۔

ان احادیث سے حضرت عثمانؓ کے مرتبہ و مقام پر بخوبی روشنی پڑتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک آپؓ کتنے مکرم و محترم تھے۔

حضرت ام کلثومؓ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

❁❁❁

فرزانہ چیمہ

چلتے چلتے

گزشتہ ماہ اخبارات میں گیلانی صاحب اوران کے وکیل اعتزاز احسن نے کافی رونق لگائے رکھی۔ کسی زمانے میں چیف جسٹس افتخار چوہدری صاحب کے ڈرائیور کا اعزاز پانے والے اعتزاز احسن صاحب ان دنوں انہی چیف جسٹس صاحب کے سامنے وزیراعظم صاحب کی طرف سے بطور وکیل صفائی پیش ہوتے ہیں۔ گیلانی صاحب کے ساتھ ساتھ اب علی موسیٰ گیلانی صاحب بھی پریشان نظر آتے ہیں چنانچہ ابا حضور کی ہدایت کے مطابق ہنی مون مختصر کر کے وطن لوٹ آئے ہیں۔ ہائے ازدواجی زندگی کی کھیر کھنڈ میں ریت ملانا کوئی رقیبوں سے سیکھے۔

ادھر جناب صدر بھی تخت لاہور کی کشش میں لاہور کھنچے چلے آئے مگر پھر وہی اتفاق کہ پنجاب کے وزیراعلیٰ شہباز شریف وطن سے باہر تھے۔ چنانچہ ان کی غیر موجودگی میں صدر صاحب خوب چہکے، مہکے اور شاید بہکے بھی کہ ان کے بیانات کچھ اسی قسم کے تھے۔ ذرا ایک آدھ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

''کارکن پریشان نہ ہوں میرے پاس ہر حملے کا توڑ ہے۔ تاریخ کسی جج کا نہیں عوام کا فیصلہ مانتی ہے: صدر زرداری''

☆''جیل کے دوران باہر جانے کی پیشکش مسترد کر دی تھی۔ کمزور دل والے معافی مانگ کر بھاگ جاتے ہیں اور مانتے بھی نہیں۔''

☆''شریف برادران کی چمک میری دی ہوئی ہے۔ جب چاہوں چھین لوں: زرداری''

واہ! کیا ہرفن مولا ہیں ہمارے صدر صاحب! ہر حملے کا توڑ موجود ہے تو پھر حضور والا اس قوم کو اتنا پریشان کیوں کر رکھا ہے؟ کیوں نہیں ان کے مسائل کا توڑ کرتے؟ انھیں سکھ چین سے ہمکنار کرتے...... رہ گئی دلوں کی بہادری اور کمزوری کی بات تو پھر اتنے جی دار اور بہادر صاحب اپنی رفیقۂ حیات کے قتل کی رپورٹ (یواین او کی مرتب کردہ) منظر عام پر کیوں نہیں لاتے۔ شریف برادران کی چمک آپ کی عطا کردہ ہے؟ چہ خوب! ہم تو سمجھتے ہیں کہ عزت ذلت، تنگی فراخی، چمک نا چمک سب اللہ قادر مطلق کی عطا ہوتی ہے۔ اب معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے صدر صاحب نے بتایا کہ یہ سب شریف برادران کو انہی کی عطا کردہ ہے۔ جب چاہیں وہ چھین لیں۔ ویسے گستاخی معاف! چار سال ہونے کو آئے تخت لاہور تو شہباز شریف صاحب کے قدموں تلے سے سرکا نہ سکے آپ جبکہ اس تخت کو حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے گئے۔ اب چمک کیسے چھین سکتے ہیں؟ اور بالفرض آپ چھیننے پہ قادر ہیں تو پھر بھلا اتنی دیر کیوں لگائی؟ اتنا حوصلہ، اتنی برداشت، اتنا ضبط بھلا پی پی کے حصے میں کب سے آ گیا؟ رہ گیا کسی جج کی بجائے عوام کا فیصلہ ماننے کی بات! تو پھر عوام کا فیصلہ ماننے میں عار کیوں ہے؟ وہ تو کب سے عالی جناب اور اس کی حکومت سے گوڈے گوڈے تنگ ہیں...... ایوانِ صدر کے قلعہ میں بیٹھ کر چمک چھین لوں گا کا ورد کرتے رہیے ان کی بلا سے!

☆......☆......☆

''روزانہ دانتوں کی صفائی عارضۂ قلب سے بچاتی ہے: ماہرین طب''

ذرائع ابلاغ کے مطابق ماہرین طب نے اپنی ایک تازہ تحقیق میں کہا ہے کہ روزانہ کی بنیاد پہ دانتوں کی صفائی سے نہ صرف دانت اور مسوڑھے مضبوط رہتے ہیں بلکہ عارضۂ قلب میں مبتلا ہونے کے خدشات میں بھی کمی آ جاتی ہے...... یہ صرف ایک دانتوں کی صفائی کا

انعام ہے اور جب کوئی مسلمان پوری طرح ظاہر باطن صاف کرلے تو پھر کیا عالم ہوگا اس کے جلووں کا دنیا میں اور آخرت میں انعامات ربانی کا۔

دانتوں کی صفائی سے ایک اور نکتہ بھی نکلتا ہے۔ دانتوں کو رزق حرام کی آلائش سے بچاتے ہوئے انھیں صاف شفاف رکھنا عارضۂ قلب سے بچاتا ہے۔ دل کی بیماری ہی سارے امراض کا گھر اور سارے فساد کی جڑ ہوتی ہے ...... ہمارے سیاستدان حضرات کو خاص طور سے اس خبر پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے صدر صاحب بھی اچن چیت بیمار ہوکر بیرون ملک تشریف لے گئے تھے کہ پاکستان میں کوئی ڈاکٹر، شاید ان کے بھروسے کا نہ تھا۔ قارئین ذرا کڑیاں ملائیں ......سوئس اکاؤنٹ ......گیلانی صاحب کو سپریم کورٹ کا خط لکھنے کا اصرار ......گیلانی صاحب کا مسلسل انکار صدر صاحب کا ہوجانا بیمار۔ دیکھئے اس چھوٹی سی خبر میں کن کن کے لیے نسخۂ شفا پوشیدہ ہے ...... ابھی بھی وقت ہے ...... سال چھ مہینے باقی ہیں۔ ابھی بھی دانتوں کی صفائی کا خیال رکھ لیں اپنے غریب، مجبور، معذور عوام کے مسائل کا ماڑا چنگا ادراک کرلیں تو شاید حافظے کے کچے عوام آپ کی چار سالہ کارستانیوں کو تھوڑا بھول ہی جائیں ورنہ ابھی تک تو آپ کی 'گڈ گورننس' کے طفیل نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ ؂

دھوبی، حجام، جمعدار، ملازم، مالی
''جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا''

☆......☆......☆

<u>''کابینہ سمیت ۳۷ افراد کو وزراء کی مراعات۔ قومی خزانے پر بوجھ بڑھ گیا۔ ملکی اور غیر ملکی قرضے بڑھتے جا رہے ہیں۔ موجودہ حکومت نے چار سال میں ریکارڈ قرضے حاصل کیے۔''</u>

صرف قرضے اٹھانے میں ہی ریکارڈ قائم نہیں کیا بلکہ ہر شعبے میں ریکارڈوں کی بھرمار کردی ہے۔ مثلاً کابینہ میں بار بار توسیع کرنے کا ریکارڈ ...... راجہ پرویز اشرف کو وزیر بنانے کا ریکارڈ کہ جو کرپشن میں ملوث رہے ہیں ...... بیروزگاری کا ریکارڈ، بجلی، گیس، پٹرول کی قیمتیں آئے دن بڑھانے کا ریکارڈ، میڈیا پہ فحاشی، عریانی بڑھانے کا ریکارڈ، خون مسلم ارزاں کرنے کا ریکارڈ، کرپشن کا ریکارڈ، سپریم کورٹ کے فیصلوں پر ٹال مٹول کرنے کا ریکارڈ، بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھانے کا ریکارڈ، عوام کو مشکلات کے بھنور میں پھنسانے کا ریکارڈ، امریکہ کی چوکھٹ پہ سجدہ ریز ہونے کا ریکارڈ، غرض کہ کس کس ریکارڈ کی بات کی جائے گویا ؂

شعلے لپک رہے ہیں چراغاں ہے ان دنوں
دل کی جراحتوں سے بہاراں ہے ان دنوں
تخلیق و فن زبون تو محنت ہے خوار، خوار
تنقیص و جہل صاحبِ ساماں ہے ان دنوں

☆......☆......☆

<u>''بھارت پر اب پہلے سے زیادہ اعتماد ہے۔ امید ہے کشمیر رکاوٹ نہیں بنے گا: حنا ربانی کھر''</u>

کیا دور کی کوڑی لائی ہیں یہ حنا صاحبہ! یا شاید کوئی پیغام ربانی اور ہے۔ بھئی بھارت نے ایسا کیا پاکستان کے ساتھ حق محبت ادا کردیا جواب پہلے سے زیادہ اعتماد کا پیغام خیر سگالی بھیجا جارہا ہے......کیا اس کے ساتھ پانی کا مسئلہ حل ہوگیا؟ کیا وہاں مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی حیثیت بحال ہوچکی......؟ آئے دن کے فسادات سے ان کی جان چھوٹ گئی......؟ ان کی گھٹی میں پڑی مسلم دشمنی کیا ختم ہوگئی......؟ محبت میں بدلنا تو دور کی بات ہے۔ دشمنی ختم ہی ہوجائے تو بھی غنیمت ہے۔ ہم بھارت نوازوں نے تجارت کی جو وسیع سے وسیع تر داغ بیل ڈالی ہے اور دوستی کا جو ہاتھ یک طرفہ طور پر بھارت کی طرف بڑھایا ہے تو کیا اس کا گرم جوشی سے جواب ملا ہے؟ ڈاکٹر خلیل چشتی کی برسوں پہ محیط قید...... بلاوجہ قید کیا دوستانہ، ہمدردانہ اور برادرانہ اقدام ہے ...... ایسے ہی کئی قیدی ابھی تک بھارت کی دوستی کا 'لطف' اٹھا رہے ہیں۔ اس کے باوجود فرمایا جارہا ہے کہ ''بھارت پر اب پہلے سے زیادہ اعتماد ہے۔ امید ہے کشمیر رکاوٹ نہیں بنے گا'' کشمیر کا کیا ہے۔ بھارت کی دوستی قائم رہے اس دوستی پر ہمارے حکمرانوں کا سب کچھ

نثار۔

جناب منور حسن صاحب نے کتنا صحیح فرمایا اگلے ہی دن کہ:

''حنا کھر نے ثابت کر دیا کہ وہ پاکستانی نہیں، بھارتی وزیر خارجہ ہیں''

اور یہی ہمارا المیہ ہے کہ ہم رہتے بستے پاکستان میں ہیں، کھاتے پاکستان کا ہیں مگر بولتے ...... گاتے غیروں کی زبان ہیں۔

واہگہ پر تجارت کے لیے نیا گیٹ بنایا گیا ہے...... حکومت بھارت کے صدقے واری جا رہی ہے۔ اغیار اور کفار ہمارے دینی رہنماؤں کے سر کی قیمتیں لگا رہے ہیں۔ ہمارے دل سے اسلام کی محبت و پیروی کھرچنا چاہتے ہیں اور ہم ہیں کہ پھر انہی کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ سو ایسے میں کشمیر پہ ہماری وزیر خارجہ کا بیان اپنے آقاؤں کی مرضی کے عین مطابق ہے ۔

ہم سیاستداں ہیں ہم کو آگہی سے کیا غرض
''مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا''
سنتے ہیں عاصؔی کہ وہ وادی ہے کشتِ زعفراں
یعنی اب ہنس ہنس کے رونا رویئے کشمیر کا

☆......☆......☆

آخر میں اپنے عزیز بیٹے محمد علی انور کی نسبت طے ہونے کے موقع پر چند اشعار:

عجب سانحہ ہے، عجب واقعہ ہے
کہ بھیا کی محفل میں بہنا نہیں ہے
ماموں کی محفل میں زینب کو ڈھونڈو!
وہ ماہ مبیں، میری خندہ جبیں ہے
رفیق سفر تھے، میرا فخر تھے جو
خبر ان کو ہو گی یہ دل کو یقیں ہے
انھیں دیں صدائیں، بہت کیں دعائیں
ٹھکانہ ہو ان کا جو خلد بریں ہے
منور رہے بیتِ انور ہمیشہ
محمد علی جب یہاں پہ مکیں ہے
اے فرزانہ! چھوڑو جدائی کی باتیں
جو وہ مہرباں ہے تو کچھ غم نہیں ہے
محمد علی کی یہ محفل سجی ہے
اور اس جیسا محفل میں کوئی نہیں ہے
ہیں آپس میں خوش دونوں انعام رب کا
کہ مروہ بھی اپنی بڑی دلنشیں ہے
وہ نغمؔہ کی لے اور ہے فخرِ خالؔد
کہ جوادؔ، حمادؔ کی وہ نگیں ہے
عمر، ماریہ اور احمد ہیں شاداں
کہ بھابی ہے پیاری، ذہین و متیں ہے
پھلیں پھولیں یارب! علی اور مروہ
کہ دونوں کا مقصود دینِ مبیں ہے
ہیں فرزانہ چیمہ کو دونوں ہی پیارے
جو اک خوبرو ہے، تو اک نازنیں ہے

شبِ ہفتہ: ۱۴ شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ/ ۱۶ جولائی ۲۰۱۱ء

تبسم زیرِ لب

ہمیں اعتراف ہے کہ ہم ایک شوہر ہیں اور ہم اس کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ہم ایک مدیر ہیں، مگر مصیبت تو یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کے نزدیک ہم صرف شوہر ہیں اور اخبار کے ڈائریکٹر صاحب ہم کو محض مدیر سمجھتے ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ بیگم صاحبہ اور ڈائریکٹر صاحب اپنی اپنی جگہ ایسے مستحکم دلائل رکھتے ہیں کہ اب ہم خود فکر میں ہیں کہ دراصل ہم مدیر ہیں یا شوہر اور اگر صرف مدیر ہیں تو شوہر کیسے ہو سکتے ہیں اور شوہر ہیں تو مدیر کیونکر بنے ہوئے ہیں یعنی ؎

اگر نہیں ہوں تو کیوں اور ہوں تو کیوں کر ہوں

بیگم صاحبہ کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم دراصل شوہر ہیں اور مدیر محض ایک معاشی ذریعہ ہے یعنی وہ یہ کہتی ہیں کہ ہم مدیر نہ ہوتے تو بھی شوہر ضرور ہوتے یعنی معاشی حیثیت سے تو یہ ممکن تھا کہ اگر ہم مدیر نہ ہوتے تو فلمی اداکار ہوتے، فلمی اداکار نہ ہوتے تو بڑھئی ہوتے، بڑھئی نہ ہوتے تو کچھ اور ہوتے۔ مختصر یہ کہ سبھی کچھ ہو سکتے تھے مگر شوہر ہونا برحق تھا اور بحیثیت شوہر ہمارے لیے یہ ناممکن تھا کہ ہم کچھ اور ہو سکتے یعنی کچھ ہوتے یا نہ ہوتے مگر شوہر تو ہونا ہی پڑتا۔ لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ ہمارا شوہر ہونا اصل حقیقت ہے اور یہ مدیری محض ایک ضمنی حیثیت ہے۔ ان مستحکم دلائل کے بعد اب ڈائریکٹر صاحب کے دعوے کو ملاحظہ فرمائیے کہ وہ بھی اپنی جگہ ایک ناقابل انکار استحکام کا حامل ہے، ان کا خیال ہے کہ شوہر ہونا تو ایک نجی اور گھریلو بات ہے مگر اس خاکسار کی عملی اور ذمہ دارانہ حیثیت یہ ہے کہ یہ خاک بسر مدیر ہے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ہماری شوہرانہ حیثیت ہماری مدیرانہ حیثیت کی منت پذیر ہے یعنی اگر مدیر نہ ہوتے تو جس آسانی کے ساتھ موجودہ اہل خانہ کے شوہر بن گئے ہیں نہ بن سکتے۔ یہ تو ممکن تھا کہ ہم ان بیوی کے نہ سہی کسی اور کے شوہر بن جاتے اور شوہر نہ ہونے کے لیے کسی خاص کاوش کی ضرورت نہ تھی، اس لیے کہ ؎

تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

(شوہریا......از شوکت تھانوی)

☆☆☆

آج کل کی عورتوں کو دو اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو موٹی ہیں، دوسرے وہ جو دبلی ہیں۔ آپ کہیں گے آخر ان دونوں میں فرق کیا ہوا؟ مگر آپ یقین جانیے کہ دونوں اقسام میں دبلے ہونے کی خواہش کے علاوہ کوئی بات مشترک نہیں۔ ان کے حدود اربعہ، خدو خال اور نقوش جدا جدا ہیں اور اس میں کاتب تقدیر کی کسی املا کی غلطی کا قطعاً کوئی شائبہ نہیں۔ اصل فرق یہ ہے کہ اول الذکر (جو صحیح معنوں میں ایک فرقے کی حیثیت رکھتا ہے) کھانے کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ دوسرا طبقہ زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہے۔ پہلا طبقہ دوا کو بھی غذا سمجھ کر کھاتا ہے اور دوسرا طبقہ غذا کو بھی بقدر دوا استعمال کرتا ہے۔ ایک کھانے پر جان دیتا ہے اور دوسرا کھانے کو دوڑتا ہے، وعلیٰ ہذا القیاس۔ فرق باریک ضرور ہے، لیکن اگر آپ نے کبھی فن برائے فن، زندگی برائے فن، فن برائے زندگی، اور زندگی برائے بندگی وغیرہ کی بحث سنی ہے تو یہ فرق بخوبی سمجھ آ جائے گا۔ اس مضمون میں روئے سخن اُس طبقے سے ہے جو دبلا نہیں ہے، مگر ہونا چاہتا ہے۔

زمانۂ قدیم میں ایران میں نسوانی حسن کا معیار چالیس صفات تھیں (اگرچہ ایک عورت میں ان کا یکجا ہونا ہمیشہ نقص امن کا باعث ہوا) اور یہ مشہور ہے کہ شیریں ان میں سے انتالیس صفات رکھتی تھی۔ چالیسویں صفت کے بارے میں مورخین متفقہ طور پر خاموش ہیں لہٰذا

گمان غالب ہے کہ اس کا تعلق چال چلن سے ہوگا۔ اس زمانے میں ایک عورت میں عموماً ایک ہی صفت پائی جاتی تھی۔ اس لیے بعض بادشاہوں کو بدرجۂ مجبوری اپنے حرم میں عورتوں کی تعداد بڑھانا پڑی۔ ہر زمانے میں یہ صفات زنانہ لباس کی طرح سکڑتی، سمٹتی اور گھٹتی رہیں۔ بالآخر صفات تو غائب ہوگئیں، صرف ذات باقی رہ گئی۔ یہ بھی غنیمت ہے کیونکہ ذات و صفات کی بحث سے قطع نظر، یہی کیا کم ہے کہ عورت صرف عورت ہے۔ ورنہ وہ بھی مرد ہو جاتی تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیتے؟

(صنف لاغر......از مشتاق احمد یوسفی)

☆☆☆

لاہور کے ایک شیر فروش پر جو دودھ میں پانی ملا کر بیچتا تھا، چار سو روپے جرمانہ ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیر فروش اناڑی تھا ورنہ دودھ میں پانی ملا کر بیچنے کی بجائے پانی میں دودھ ملا کر بیچتا تو جرمانے سے بچ جاتا۔

مثل مشہور ہے: ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس''۔ پولیس کے ہاتھوں میں تو ہمیشہ ڈنڈا رہا ہے، سیاسی لوگوں کے ہاتھ میں ووٹ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ووٹ بھی ڈنڈا بن گیا ہے یعنی یہ دونوں ڈنڈے والے ہیں اور حکومت صرف بھینس بن کے رہ گئی ہے جس کا جی چاہے ڈنڈے کے زور سے اسے جدھر چاہے لے جائے۔

ہم اور آپ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ بین بجاتے رہیں یعنی کبھی یہ کہہ دیں کہ اے صاحب! عوام کے حقوق کا بھی خیال کیجیے۔ دیکھیے فلاں الاٹمنٹ ناجائز ہے لیکن ہم بھینس کے آگے بین بجا رہے ہیں اور بھینس موسیقی کا ذوق نہیں رکھتی۔ وہ ذرا کان کھڑے کرتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری بھیرویں اس کی سمجھ میں آ گئی اور وہ کان کھڑے کر کے داد دے رہی ہے حالانکہ کان کھڑے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مکھیاں اسے تنگ کر کے الاٹمنٹ میں اپنا حصہ مانگ رہی ہیں۔

ہمارا دل گردہ دیکھیے کہ ہم بین بجاتے بجاتے اکتاتے نہیں۔ یہ نہیں کیا کہ بین وہیں پٹک کر سیدھے اپنے گھر چلے آئے ہوں بلکہ یہ سوچ کر بین بجائے جا رہے ہیں کہ کیا عجب ہے کہ ہماری محنت پروان چڑھے، یعنی بھینس بین سنتے سنتے پسیج جائے۔

(حرف و حکایت......از چراغ حسن حسرت)

۞۞۞

شمیم فاطمہ

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو!

ملک عزیز پر ڈرون حملے کرنے والوں نے آسکر ایوارڈ کے کھلونے سے ہمیں بہلا دیا اور ہم اس عزت افزائی پر جھوم اٹھے

آپ نے کبھی آئینہ دیکھا ہے؟

ضرور ہی دیکھا ہوگا کہ ہر گھر میں کم از کم ایک آئینہ تو ضرور ہی ہوتا ہے۔ اب آئینہ دیکھ کر آپ شکر کریں یا ناشکری، یہ آپ کا ذاتی فعل ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ جب انسان اپنی ذاتی آنکھوں سے اپنا ذاتی منہ دیکھتا ہے تو اسے اچھا ہی لگتا ہے۔

آئینہ دیکھنے کے لیے سب سے ضروری چیز آنکھیں ہیں (یہ اور بات ہے کہ جنھیں آنکھیں میسر ہوتی ہیں وہ اپنے گریبان میں کم ہی جھانکتے ہیں، ادھر ادھر ہی دیکھتے رہتے ہیں، کبھی ارادہ کر کے کچھ دیکھتے ہیں، کبھی بے ارادہ ہی نظر اٹھ جاتی ہے اور بسا اوقات اٹھی کی اٹھی رہ جاتی ہے نہ نظریں ہٹانا یاد رہتا ہے نہ پلکیں جھپکانا!

اللہ جن کو وسعت نظری عطا کرتا ہے ان کی تو بات ہی کیا ہے! انہی دو آنکھوں سے کیا کیا نہیں دیکھ لیتے اور خواہش مند رہتے ہیں کہ ''دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے!''

مگر ایک عام آدمی ہمیشہ کوتاہ بینی اور تنگ نظری کا ہی شکار رہتا ہے۔ کبھی غم روزگار اسے اتنی فرصت نہیں دیتی کہ وہ دال روٹی سے نظریں ہٹا کر سبزہ و گل پر بھی نظر ڈال لے اور سوچے کہ

؎ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

گرمیاں آتی ہیں تو پسینے سے شرابور ہائے ہائے کرتا، دستی پنکھے جھلتا اور کسی پیڑ کے سائے تلے ستا لیتا ہے۔ کالی گھٹاؤں کو دیکھ کر بغرضِ لطف اندوزی نہ ساحل کا رخ کرتا ہے نہ ہٹ بک کرواتا ہے نہ گھر والوں کو کھانا باہر کھلانے کی آفر کرتا ہے۔ بھاگم بھاگ گھر پہنچتا ہے کہ ٹپکتی ہوئی چھت گھر کے ''قیمتی اثاثوں'' کو تہس نہس نہ کر دے۔ نہ جیب میں اتنا دھیلا ہوتا ہے کہ شمالی علاقہ جات کا ٹور ہی لگا لے، جنت نہ سہی جنت نظیر وادیوں کی دید سے ہی سیراب ہو جائے مگر......

(عام آدمی ساری عمر پرانی بیوی اور نئے مسائل ہی کو دیکھتا رہتا ہے) اس کی آنکھوں کا دائرہ کار بھی اس کی خوشیوں اور وسائل کی طرح محدود ہی ہوتا ہے۔ اس کی نظروں کی حدود میں زیادہ سے زیادہ ٹی وی اور اخبار ہی آتے ہیں سو وہ ان میں وہ دست و بازو چشم و لب و رخسار...... جنھیں دیکھنا نہیں چاہیے وہ بھی دیکھ لیتا ہے اور اپنا ایمان بچانے کے لیے یہ دعا بھی کرتا ہے کہ ''نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو!''

اب آپ دست و بازو دکھانے والے کو قصوروار گردانیے یا دیکھنے والوں کو گنہگار سمجھیے، ہم تو اس فتنہ سازی اور دعوتِ نظارہ کا سہرا فیشن انڈسٹری کے سر باندھتے ہیں۔ اگر ہمارے ڈریس ڈیزائنرز اس وضع کے لباس تیار کریں جو ساتر ہوں، اسلامی اور مشرقی اقدار کی نمائندگی کریں جو اتنا ''ویسٹرن لک'' نہ دیں کہ پاکستانی لڑکی پہنے تو اس پر ''امریکن لیڈی'' کا گمان ہو۔ اب آسکر ایوارڈ حاصل کرنے والی پاکستانی خاتون ہی کو دیکھ لیجیے کہ جن کے دست و بازو تو ایک زمانے نے عریاں دیکھے......نہ سر پر آنچل نہ بازوؤں پر آستین! ملک عزیز پر ڈرون حملے کرنے والوں نے آسکر ایوارڈ کے کھلونے سے ہمیں بہلا دیا اور ہم اس عزت افزائی پر جھوم جھوم اٹھے۔ فخر پاکستان! ہلالِ امتیاز! تالیاں! داد و تحسین! (آدمی ہتک آمیزی کو عزت افزائی سمجھ لے تو کتنا خوش ہوتا ہے!) سب نچھاور کر دیا۔ اگر پاکستانی ڈیزائنرز ایسے لباس بناتے جو مکمل لباس ہوتے، جس میں آستینیں بھی ہوتیں اور دوپٹے

اس کی نظروں کی حدود میں زیادہ سے زیادہ ٹی وی اور اخبار ہی آتے ہیں سو وہ ان میں جنھیں دیکھنا نہیں چاہیے وہ بھی دیکھ لیتا ہے

بھی، تو شاید شرمین عبید ہی ساتر لباس میں ایوارڈ وصول کرتیں اور ہم ان کے دست و بازو دیکھ کر استغفار نہ پڑھ رہے ہوتے۔

ہمارے ہاں خواتین لباس کے معاملے میں چھوئی موئی سے زیادہ حساس واقع ہوئی ہیں، ڈریس ڈیزائننگ کی فکر ان کے دماغ سے یوں چمٹی رہتی ہے جیسے چمبیلی کے پیڑ سے عشق پیچاں چمٹی رہتی ہے۔ چنانچہ بہو، بیٹیاں، بہنیں اور بیگمات ڈراموں اور اخباروں سے غیر محفوظ ہونے کے باعث ان سے اس حد تک مستفیض ہوتی ہیں کہ ان میں چھپنے والی رنگین تصویریں کاٹ کاٹ کر اپنی ڈائری میں یوں محفوظ کر لیتی ہیں جیسے ہمارے حکمران سوئس بینک میں غبن شدہ رقم محفوظ کر لیتے ہیں۔ اخباروں کے یہ تراشے جہادِ زندگانی میں عورتوں کی شمشیریں بن جاتے ہیں۔ یعنی جس طرح بوقت جہاد مرد نیام سے اپنی شمشیریں نکال کر دشمنوں کا سر قلم کرتے ہیں ہماری خواتین متوقع فنکشن سے پہلے اپنی ڈائری سے یہ تراشے نکالتی اور ٹیلر کے پاس پہنچ جاتی ہیں پھر ان کے سر ہو جاتی ہیں کہ ہمیں بالکل ایسا سوٹ سی دیجیے۔ جولڑکیاں ٹیلرنگ شاپ نہیں جاتیں وہ ماؤں کو تاکید کرتی ہیں ''امی! بالکل ایسا ڈیزائن ہونا چاہیے اگر آپ نے اس میں ذرا بھی ڈنڈی ماری تو پھر آپ ہی پہنئے گا میں تو نہیں پہنوں گی۔''

جولڑکیاں کسی مالی بحران کا شکار نہیں ہوتیں وہ سیدھی ''بوتیک'' کا رخ کرتی ہیں جو سوٹ پسند آیا منہ مانگے داموں اٹھا کر لے آتی ہیں۔ نہ سیلوز کا پتہ کرتی ہیں نہ دوپٹے کا۔ (روشن خیال طبقہ ان جھمیلوں میں پڑتا بھی نہیں ہے) ایسی جامہ زیبی کہ جس نے دیکھا، سراہا۔ اٹھلا اٹھلا کر بتاتی ہیں کہ ''فلاں ڈیزائنر کا ہے'' پوچھنے والی کی آنکھوں میں رشک دیکھ کر آتما کو چین آتا ہے کہ ''دیکھا کیسی دھاک بیٹھی!''

پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا، گلیمر دونوں کی ترجیح ہے۔ مارکیٹنگ کی دنیا میں سادگی کا کیا کام؟ ڈراموں، اشتہاروں میں ایکٹرس اور ماڈلز ساتر لباس میں آئیں تو نہ اشتہار چلتا ہے نہ ڈرامہ پرائم ٹائم میں چلایا جا سکتا ہے۔ اخباروں کے مالکان کو بھی خدشہ رہتا ہے۔ خبریں تو آناً فاناً خوشبو کی طرح اڑ کے قارئین کے دل میں اتر ہی جاتی ہیں لہٰذا اخبار بیچنے کے لیے اس میں تصویر لگائی جاتی ہیں اور وہ بھی رنگین، تاکہ آنکھوں والا انھیں نعمت سمجھ کر بار بار دیکھے اور اپنی بصارت کی درستگی پر اطمینان کا سانس لے۔

جس طرح تیر کے نشان والی ڈسپرین کی گولی سر درد میں فوری آرام پہنچاتی ہے، اسی طرح ایکٹرس اور ماڈلز کے ڈریس ہمارے فیشن انڈسٹری میں فوری نقل کیے جاتے ہیں اب چونکہ کوئی چیز اپنی اصلی اور خالص شکل میں دستیاب نہیں لہٰذا ہماری زبان، ہماری شناخت، ہمارا چلن، ہماری خوراک اور ہمارا لباس بھی ملاوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔ ہر میدان میں مقابلے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے لیے سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ اس دوڑ کے بعد منزل ملے گی یا لٹی منزلوں کی دھول!

وقت

ایک نظر نہ آنے والی طاقت

ہوا کسی کو نظر نہیں آتی مگر ہوا کے وجود سے کسی کو کوئی انکار نہیں، وقت بھی اسی طرح نہ دیکھا جا سکتا ہے، نہ چھوا جا سکتا ہے نہ ہی سنا جا سکتا ہے۔ وقت کی مثال روح کی طرح ہے۔ وقت گزرتے دیکھ سکتے ہیں، اس کو گن سکتے ہیں، اس کے گزرنے کے اثرات بھانپ سکتے ہیں۔ یہ غیر مادی طاقت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب یہ کائنات پیدا کی تو وقت کو بھی پیدا کیا۔ وقت کی مقدار کا تعین دن رات، ماہ و سال سے ہوتا ہے۔ انسان چونکہ بنیادی طور پر مادہ پرست ہے۔ حیوانی خصلتوں یعنی سننے، دیکھنے پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ اس لیے وقت جیسی غیر مادی، غیر مرئی طاقت کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دن کی مقدار سب انسانوں کے لیے پیدا کی ہے۔ وقت کا بنیادی احساس لوگوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کو بھی ہے۔

جیسے جانور سورج ڈھلنے سے پہلے اپنے گھر آ جاتے ہیں، شام ڈھلے پرندے گھونسلوں کو واپس آتے ہیں۔ انسان کی ناشکریوں میں سے ایک بہت بڑی ناشکری وقت کی کمی کی شکایت کرنا ہے۔ خصوصاً عورتیں اس سلسلے میں مشہور ہیں کہیں ملنے کا وقت نہیں کہیں دوا کھانے کا وقت نہیں۔ اپنی ذات کو نکھارنے یعنی پڑھائی لکھائی کا بھی وقت نہیں ہے۔ وہی چوبیس گھنٹوں کے دن اور رات کسی کے لیے کم، کسی کے لیے بہت کم اور کسی کے لیے کافی اور کسی کے لیے زیادہ بھی ہو جاتے ہیں۔ عموماً نوجوانوں سے یہ جملہ سننے کو ملتا ہے کہ وقت گزر نہیں رہا، بوریت ہو رہی ہے۔

سورۃ العصر قرآن پاک کی مختصر سورہ ہونے کے باوجود عظیم پیغام رکھتی ہے۔ عصر کا وقت تیزی سے ڈھلتا ہوا اور ختم ہوتا ہوا وقت ہوتا ہے۔ ''قسم ہے زمانے کی، بلاشبہ/ یقیناً انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور حق پر اور صبر پر قائم رہے۔''

وقت سے کام لانے کے لیے اگر ہم نے نیک اعمال نہیں کیے سچ نہیں بولا، سچ کا ساتھ نہیں دیا اور صبر نہیں کیا تو ہم نقصان اٹھائیں گے۔

وقت انسان کو بچے سے جوان، جوان سے بوڑھا بنا دیتا ہے۔ بڑھاپے میں انسان اپنی بیماری، کمزوری اور قوت کی کمی کی شکایت کرتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے جوانی بھرپور انداز میں گزاری ہو اور وقت نہ ضائع کیا ہو ان کا بڑھاپا بھی بے کار نہیں ہوتا۔ وہ اس عمر میں بھی اپنے تجربے سے لوگوں کو فائدہ پہنچا رہے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات ایک ہی وقت میں علیم، خبیر، خالق اور حکیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو متحرک رکھنے اور وقت کا احساس دلانے کے لیے کائنات کی ایسی تخلیق کی ایسا انتظام مرتب کیا ہے کہ ہر انسان کو وقت کے گزرنے کا احساس دلاتا ہے۔ چڑھتا سورج، ڈھلتی روشنی، نور کا تڑکا، یہ نشانیاں ہیں مگر آج کا انسان کمروں میں بند ہے اس لیے وہ ان کا مشاہدہ بہت کم کر پاتا ہے۔

وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ آج تیز دھوپ اور گرمی ہے اور کل سردی ہے، یہ قانون بھی سکھاتا ہے کہ زندگی میں کبھی نشیب ہے تو کبھی فراز، کبھی ہنسنا ہے تو کبھی رونا، عقلمند انسان وہ ہے جو وقت سے فائدہ اٹھا لے۔

وقت ایک گھوڑا ہے، اگر آپ اس پر سوار ہو جائیں تو یہ آپ کو کہیں سے کہیں پہنچا دے گا اور اگر آپ نے اس کو قابو نہ کیا تو یہ آپ کو چھوڑ کر آگے دوڑ جائے گا۔

یہ نمازیں وہ الارم ہیں جو ہمیں وقت کے گزرنے کا پتہ دیتی ہیں کہ دن کے اتنے پہر گزر چکے ہیں، جس طرح امتحان میں

وقت کبھی نہیں رکتا، انسان کی موت آ جاتی ہے مگر وقت چلتا رہتا ہے۔اصل میں انسان کا اپنا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

اس نظام قدرت میں ہمارے عظیم ترین اور زبردست علم رکھنے والے خالق نے ہمیں نمازوں جیسے انوکھے اور لاجواب تحفے سے نوازا ہے۔ یہ نمازیں وہ الارم ہیں جو ہمیں وقت کے گزرنے کا پتہ دیتی ہیں کہ دن کے اتنے پہر گزر چکے ہیں، جس طرح امتحان میں طالب علموں کو بار بار وقت کی یاددہانی کرائی جاتی ہے کہ ان کا کوئی جواب رہ نہ جائے۔مگر انسان بہت بے وقوف ہے کہ اکثر انسان تو اس الارم سسٹم اور وقت کی پابندی کے فلسفے کو سمجھتے ہی نہیں۔ حالانکہ نماز کی ادائیگی کے لیے اول شرط وقت کی پابندی ہے۔اول وقت میں نماز ادا کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ نماز کے وقت پر ادا کرنے سے جسم دوسرے تیسرے دن اس عمل کا عادی ہو جاتا ہے۔ہمارے دماغ کے خلیات میں ایک ہی عمل بار بار دہرانے سے اور ایک خاص وقت پر کرنے سے دماغ میں پختگی کا عمل شروع ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ انسان کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ جیسے جانوروں کو کسی ایک مقررہ وقت پر دانہ ڈالا جائے تو وہ دانہ ڈالنے سے پہلے ہی پہنچ جاتے ہیں اسی لیے وقت کی پابندی کی بھی یہی مصلحت ہے کہ ہمارے جسم کا چھوٹے سے چھوٹے جزو بھی اس وقت کے بندھن میں بندھا رہے۔نماز معراج المومنین ہے تزکیہ نفس اور خشوع وخضوع اس کی روح ہے۔نماز اور وقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔نمازوں کی یہ ڈرل روزانہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے وقت کے گھوڑے پر سوار رہے۔ورنہ یہ گھوڑاا انسان کو روندکر آگے نکل جائے گا۔

ہم اپنا وقت کہاں ضائع کرتے ہیں؟

خواہشات نفس، کھانا، سونا ضرورت سے زیادہ بے کار فضول باتوں اور کاموں میں وقت ضائع کرنا، سستی اور کاہلی، جس سے پناہ مانگی گئی ہے اس میں وقت ضائع کرنا۔

آج کا برقی دور جس میں بجلی کی وجہ سے رات دن برابر ہیں آج کی اور پرانے زمانے کی زندگی میں بہت فرق ہے۔ٹی وی کمپیوٹر، موبائل فون، انٹرنیٹ تمام سہولتیں ہیں مگر ان کا غلط استعمال وقت کے ضیاع کا سبب بنتا ہے۔

ٹی وی کے پروگراموں میں زیادہ اشتہارات اور انٹرنیٹ پر معلوماتی چیزوں کے ساتھ غیر مستند مواد اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کی جانچ پرکھ میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔

ٹیلیفون کو بات چیت کے مؤثر ذریعے کے علاوہ وقت گزارنے کا طریقہ بھی بنا لیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ انسان کے دن کو رات بنا دینے کی اور رات کو دن بنا دینے کی وجہ سے زیادہ بگاڑ شروع ہوا ہے۔ کیونکہ ایسا نہ ہوسکتا تھا اگر ہمارے پاس بجلی نہ ہوتی۔

رات کو دیر سے سونے سے نیند کبھی بھی پوری نہیں ہوتی اور انسان کبھی بھی تازہ دم نہیں ہوسکتا، پھر صبح کی نماز اور سیر کا تصور ہی مشکل ہے۔بہت جہد اور مشقت سے صبح کو اٹھ کر کام نبٹائے جاتے ہیں کہ رات کی گہری نیند ہی حاصل نہیں ہوئی۔ جب انسان قانون قدرت کے خلاف چلتا ہے وہ اپنے پاؤں پر ہی کلہاڑی مارتا ہے۔ جس طرح نمازوں کا نظام انسان کو باہر سے متحرک رکھتا ہے انسان اگر دن میں کام کرے تو وہ رات میں تھکتا ہے اور اسے گہری نیند آ جاتی ہے۔اگر انسان صبح دیر سے اٹھے گا تو رات کو نیند کہاں سے آئے گی۔ رات کو، ایک مخصوص وقت پر جاگنے اور سونے سے انسان کی آنکھ خودبخود بغیر الارم کے کھل جاتی ہے یہ Sleep cycle کہلاتی ہے۔آج کے دور میں نیند کی بیماریاں اتنی زیادہ نہیں ہیں جتنی لوگوں کی Sleep cycle خراب ہے اور لوگوں کو جسمانی تھکان کا تجربہ ہی نہیں ہوتا۔ زیادہ کام بیٹھ کر کرنے والے ہیں۔ پیدل چلنے کا رواج ختم ہو گیا ہے خواتین کا انحصار زیادہ نوکروں پر ہے۔اس لیے باوجود وقت زیادہ ہونے کے عجیب سی

غیر منظم صورتحال ہے۔

ہمارے پیارے نبی حضرت محمدﷺ نے امت کے لیے خصوصی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی کی تھی کہ ''اے اللہ میری امت کی صبح میں برکت ڈالنا۔'' آج ہم نے دن اور رات کو الٹ کر کے اس برکت کو خود ہی کھو دیا ہے۔ بہت افسوس کا مقام ہے دوسرے لفظوں میں ہم نے اپنی چابی الٹی گھما دی۔ بہت سے ممالک میں ہفتے وار چھٹی کے علاوہ عام دنوں میں دکانیں رات کو جلدی بند ہو جاتی ہیں۔ تاکہ لوگ رات کو جلد سوئیں اور علی الصبح اٹھ کر اپنے کاروبار زندگی کو شروع کریں۔ اسی وجہ سے وہ قومیں ترقی یافتہ ہیں اور ہم دیر سے سونے جاگنے والے ترقی پذیر اقوام میں شمار ہوتے ہیں۔

اللہ نے یہی وقت ہم سے پہلے لوگوں کو بھی دیا تھا۔ پہلے زمانے کی عورتیں جیسے ہماری نانیاں، دادیاں کم سہولیات کے باوجود ہم سے زیادہ اپنے گھر والوں کا پڑوسیوں کا اور رشتے داروں کا خیال رکھنے والی تھیں۔ وہ اپنے کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ جسمانی تھکاوٹ کے بعد ان کا وزن اعتدال میں رہتا تھا اور نیند بھی خوب گہری آتی تھی۔ آپس کے تعلقات بھی بہت اچھے تھے۔ آج خواتین تمام نعمتیں ہونے کے باوجود ڈائٹ کھانا کھانے پر مجبور ہیں۔

قرآن پاک میں کئی جگہوں پر آیا ہے کہ آخرت کے مقابلے میں اس دنیا کی زندگی جیسے ایک پہر ہو یا ایک پہر سے بھی کم حصہ، اس لیے کتنا قیمتی ہے یہ پہر جس کے اوپر پورے آخرت کے وقت کا دارومدار ہے۔

وقت کی ایک انوکھی بات ایک حکمت جو ہمارے مالک حکیم نے ہم سے پوشیدہ رکھی کہ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کتنے وقت کے لیے اس دنیا میں آیا ہے۔ اس کی عمر کتنی ہے معلوم نہیں۔ پھر تو یہ امتحان بہت سخت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے وقت میں برکت ڈالے اور اس کو صحیح استعمال کرنے کی توفیق دے۔......(آمین)

☆☆☆☆

ثمینہ سعید☆

آہ! مولانا عبدالحق بلوچ

اپنے ہزاروں عقیدت مندوں اور اہل خانہ کو سوگوار اور مضطرب چھوڑ کر جانے والی ہستی مولانا عبدالحق بلوچ، مرحوم ایک بندہ مومن اور مرد درویش تھے۔ فقیرانہ زندگی گزارنے والے مولانا عبدالحق کی شخصیت اور اُن کی شفقت نے مجبور کیا کہ قلم اٹھاؤں اور اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کروں۔

۱۶/ مارچ ۲۰۱۰ء کو جب یہ اطلاع ملی کہ مولانا اس دارِفانی سے کوچ کر رہے ہیں تو بے اختیار اُن کے لیے ہر لب پر دعا تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو روشن اور منور کردے۔ ۶۳ برس کی عمر میں مولانا اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

مولانا عبدالحق بلوچ صوبہ بلوچستان کے ضلع کیچ (تربت) کے ایک دورافتادہ پہاڑی علاقے زامران کے گاؤں ''دریکان'' میں ۵/ جنوری ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا محمد حیات ایک جید عالم دین اور نہایت معتبر مذہبی شخصیت تھے۔ مولانا عبدالحق بلوچ نے ابتدائی تعلیم اپنے والدمحترم سے حاصل کی۔ عربی، فارسی، فقہ وحدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب مولانا کا خاندان تربت میں آبسا تو آپ نے گورنمنٹ ہائی سکول تربت سے میٹرک کا امتحان ۱۹۶۶ء میں پاس کیا۔ مزید تعلیم کراچی کی درسگاہ دارالعلوم کورنگی میں حاصل کی۔ مولانا قدرتی طور پر ایک ہی گردے کے مالک تھے اور اس گردے نے ۶۳ سال تک ان کا ساتھ دیا۔ اُن کی وفات نے بلوچستان کے ہر طبقے، ہر مسلک اور ہر سیاسی وفاداری کے حامل ہزاروں انسانوں کو سوگوار کیا ہے۔

مولانا عبدالحق بلوچ فطرتاً اعتدال پسند، وسیع النظر، حکمت و دانش سے مالا مال تھے اور یہ اوصاف ان کی خاص تربیت کا حصہ تھے۔ وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکری تحریروں سے متاثر تھے اور ان سے ملاقات بھی کر چکے تھے مولانا کی اسی وابستگی کی بدولت وہ آگے چل کر جماعت اسلامی کے رکن بنے اور امیر صوبہ کی ذمہ داریاں اور نائب امیر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں ادا کیں۔

مولانا سے میری پہلی دفعہ بات ٹیلی فون پر ہوئی جب وہ امیر صوبہ تھے۔ نہایت نرم لہجہ اور نرم اندازِ گفتگو تھا۔ جامعۃ المحصنات کوئٹہ کی تعمیر کے سلسلے میں اُن سے کوئی بات کرنی تھی۔ امیر صوبہ تھے۔ لہٰذا کچھ ڈرتے ہوئے بات کر رہی تھی لیکن بات کرنے کے بعد میرا ڈر جاتا رہا بلکہ حوصلہ بڑھا کیونکہ وہ بیٹی کہہ کر بات کر رہے تھے۔ حضرت مولانا عبدالحق بلوچ علم کا ایک گہرا سمندر تھے اتنا علم مگر سادگی اور قناعت میں بھی حد سے گزرے ہوئے۔ متانت اور توکل علی اللہ کا منہ بولتا ثبوت۔ ایک طرف علم کا گوہرِ نایاب تھے لیکن دوسری طرف سادگی کا پیکر۔ علم کے ساتھ عمل کی تصویر اگر کہیں نظر آتی تو مولانا کی شخصیت میں۔

جس دن مولانا کے خالق حقیقی سے جا ملنے کی خبر ملی اور ہم ان کے گھر گئے تو گھر میں ان کی ایک بیٹی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ مولانا محترم کا کمرہ کتابوں کی تین عدد الماریوں کے علاوہ سامان دنیا سے بے نیاز تھا۔ امت الرقیب صاحبہ نے دعا کی کہ اے اللہ ہم مولانا کے حق میں گواہی دیتے ہیں کہ وہ مردمومن تھے، وہ فقیر اور درویش انسان اور باعمل مسلمان تھے۔ حقیقت میں ان کی زندگی صبر وقناعت اور زہد و درویشی سے عبارت تھی۔

مولانا اگرچہ ایک ذہین اور طباع محقق تھے تاہم انھوں نے اپنی زندگی میں ایک ہی کتاب باقاعدہ طور پر لکھی یہ کتاب ''ذکری مسئلہ''

کے نام سے شائع ہوئی اور اس موضوع پر تجزیہ وتحقیق، تاریخی وسماجی پس منظر کے تفصیلی احاطے کی بنا پر معتبر گردانی گئی۔ وہ بلوچستان کے لوگوں کے لیے بہت فکر مند نظر آتے تھے۔ وہ آخری دم تک تحریک اسلامی اور ملک وملت کی خدمت انجام دیتے رہے۔

مولانا عبدالحق بلوچ نے ۱۹۸۵ء میں ہونے والے الیکشن میں صوبائی اور قومی اسمبلی دونوں نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ لیکن پھر صوبائی اسمبلی کی نشست کو چھوڑ دیا۔ اپنے علاقے اور صوبے کی بھرپور نمائندگی کی متحدہ مجلس عمل کے قیام میں اپنی ذاتی کوششوں سے علمائے کرام اور دینی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے میں خاص کردار ادا کیا۔

ایسے انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے جو اپنے علم، تقویٰ، سادگی اور عمل سے اس دنیا میں اپنا مقام بناتے ہیں اور آخرت میں اللہ کے انعامات کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔

ہمیشہ مولانا محترم نے راہنمائی فرمائی۔ ہمیشہ بات کو نہایت غور اور توجہ سے سنا۔ صوبائی اسمبلی کی ممبر کی حیثیت سے اکثر ان سے رابطہ رہتا۔ بھرپور انداز سے راہنمائی فرماتے۔ ایک استاد سے بڑھ کر ایک روحانی اور فکری پیشوا کی طرح ایک ایسے داعی تھے جو اپنی دعوت کا سچا نمونہ تھے۔ نہایت سادہ لباس اور سادہ خوراک۔ اکثر ان کے گھر جانا ہوتا تو حیرانگی ہوتی کہ اتنے بڑے عالم دین اور تصنع ، بناوٹ سے پاک، آج کے دور میں ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں! بلوچستان کے حالات پر متفکر نظر آتے۔ ان کی سوچ اور ان کا وژن وسیع تھا۔ روایتی مولوی والا انداز بالکل نہیں تھا۔

اللہ رب سبحانہ تعالیٰ ان کی بشری کمزوریوں سے درگزر فرمائے، انھیں اپنی جوارِ رحمت میں عظیم مقام سے نوازے اور ان کی کوششوں کو ان کے حق میں حجت بنائے۔ آمین۔

زہرانہالہ

جواب حاضر ہے

اس ماہ سے ہم آپ کے لیے سوال جواب کا نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ خواتین کی ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں یا گھریلو مسائل اور بچوں کی پرورش وغیرہ کے حوالے سے سوالات کے قابل عمل حل بتائے جاسکیں۔ ہم آپ کی آرا اور سوالات کے منتظر رہیں گے۔ (ادارہ)

اُمِ حسن۔ فیصل آباد

سوال: میں ایک دیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ گھر میں الحمدللہ قرآن پاک پڑھنے پڑھانے کا اہتمام بھی ہے اور دروس میں شرکت کرنے کا بھی۔ دل میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکامات کی فضیلت واہمیت بھی ہے۔ (الحمدللہ) اور عمل کرنے کا شوق بھی۔ لیکن اس سب کے باوجود ایک گناہ ایسا ہے جس سے کسی طرح جان چھڑائے نہیں چھٹتی اور وہ ہے غیبت...... یقین کیجیے کہ جب غیبت کرتی ہوں تو فوراً شرمندگی بھی ہوتی ہے۔ دل میں اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگتی ہوں۔ آئندہ کے لیے پکے ارادے بھی باندھتی ہوں کہ اب غیبت نہ کروں گی مگر پھر توبہ ٹوٹ جاتی ہے اور اس رذیلہ اخلاق میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ اس کا کوئی علاج بتایئے!

جواب: پیاری بہن آپ نے جس مشکل کا ذکر کیا ہے اس میں اکثر و بیشتر خواتین مبتلا ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ کو اس کا احساس ہے۔ غیبت کو زنا سے بدتر کہا گیا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ جہاں تک توبہ واستغفار کا تعلق ہے تو اس کو جاری رکھیے۔ بزرگوں نے اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا ایک علاج بتایا ہے۔ اگر آپ مصمم ارادہ کریں اور اس علاج پر عمل کر ڈالیں تو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ اس عادت سے جان چھڑا لیں گی۔

علاج یہ ہے کہ آپ سے جس کی بھی غیبت ہو جائے اس سے رابطہ کیجیے۔ خط کے ذریعے، ای میل کے ذریعے، فون یا ایس ایم ایس کے ذریعے یا بالمشافہ اور اس فرد سے کہیے کہ مجھ سے غلطی سے آپ کی غیبت ہوگئی ہے میں اس پر سخت شرمندہ ہوں اور ان شاءاللہ آئندہ آپ کی غیبت نہ کروں گی۔

یہ علاج ہے تو مشکل لیکن آپ نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اس کو کر لیا تو اس مرض سے افاقہ کے امکانات ہیں۔ ان شاءاللہ

۞۞۞

محشرِ خیال

رشیدہ قطب۔فیصل آباد

جنوری کے بتول میں تیمیہ صبیحہ کے مضمون ’’آنکھیں ترستیاں ہیں‘‘ نے جیسے دل کے پرزے اڑا دیے۔فوراً آپ کو فون کیا کہ کون صاحبہ ہیں،معلوم ہوا کہ اپنی ہی بیٹی ہے۔پھر سعدیہ نے بھی بتایا، پیا کی وجہ سے سعدیہ کا ڈاکٹر ام کلثوم سے دلی تعلق ہے۔ڈاکٹر صاحب کے وقت رخصت وہ وہاں موجود تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کمال کی شخصیت تھے۔حیرت انگیز!اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے آمین۔بیٹی نے بھی حق ادا کر دیا۔انتہائی موثر اور منفرد تحریر!

لکھنے میں بہت دیر کردی بس یہی حال ہے کیا کیا جائے ۔ مضمحل ہو گئے قویٰ غالب!

ورنہ بہت سی تحریریں حق رکھتی ہیں کہ تعریف کی جائے۔

ڈاکٹر بھائی کی رسالے میں شمولیت بہت اچھا اضافہ ہے۔

مونیکا مارکس کے مضمون نے بہت متاثر کیا۔جزاک اللہ۔

چلتے چلتے کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ چلئے پھر چلنا شروع ہو گیا، بہت اچھا۔

ہاں سچ!ادارتی عملے میں آسیہ راشد بیٹی کی شمولیت بہت اچھی لگی۔تصور نصف صدی پہلے لے گیا۔ان کے مضامین کا سلسلہ بہت پسند آیا۔اسے جاری رہنا چاہیے،اللہ خوش رکھے۔آمین۔

☆☆☆

سیدہ فاطمہ گیلانی۔ساہیوال

نصرت یوسف نے معاشرے کے سارے کرداروں میں حقیقت کے رنگ بھرے ہیں خصوصاً سکندر کی ماں کا کردار قابل تقلید ہے۔فریحہ مبارک کی تحریر’’قدموں کی خاک‘‘ نے تو نصاب میں پڑھی ہوئی دہلی والوں کی زبان اور انداز کو یاد کروا دیا ہے۔

بہن قانتہ رابعہ کے سفر سعادت’’دخولِ مدینہ‘‘ نے قدیم وجدید مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔شمیم فاطمہ کے انشائیہ کاہے کو بیاہی نے معاشرے کی خصوصاً گھر کے اندرون کی تصویر کشی کی ہے اور اس فقرے نے دکھے دلوں کو اور دکھا دیا کہ گھروں کو بسانے کا فن نجانے ہم کب سیکھیں گے۔اور پھر یہ کہ کوئی اچھی مصروفیت اور تفریح ہی نہیں ہے جس سے خیال بٹ جائے۔

مریم محمود

گرمی کے فرحت بخش مشروبات

گرمیوں کا موسم

گرمیوں کا موسم جسم و جان پر ایک عتاب بن کر نازل ہوتا ہے اور اس عالم میں کوئی بھی چیز انسان کو اس قدر زیادہ تسکین بہم نہیں پہنچاتی جتنا کہ ٹھنڈے شربت کا ایک گھونٹ۔ چھوٹے بچے ہوں یا نوجوان لڑکے، لڑکیاں یا بزرگ افراد ہوں۔ ایسے موسم میں سب کو ہی ٹھنڈے مشروب کے ایک گلاس کی طلب بے قرار رکھتی ہے۔

ہر گھرانے کا یہ تجربہ ہے کہ اگر ایک ہی قسم کا مشروب استعمال کیا جائے تو پینے والے جلد ہی اس سے اکتا جاتے ہیں یا وہ انھیں اچھا نہیں لگتا۔ پھر اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ نئے ذائقوں کو تلاش کیا جائے اور ورائٹی کی تلاش شروع ہوتی ہے۔ ورائٹی کی اہمیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے؟ یہی تو زندگی کا اصل مزہ ہے کسی بھی شعبہ زندگی میں ورائٹی کے بغیر تو گزارا ہی نہیں ہے۔

فی الوقت بے شمار سر بند مشروبات اور پھلوں کے رس وغیرہ بازار میں موجود ہیں اور ان کی خوب فروخت ہو رہی ہے۔ لیکن ان کے استعمال کے سلسلے میں دو مشکلات ہیں۔ وہ دو قسم کے بوجھ پیدا کرتے ہیں۔ ایک بوجھ تو وہ جیب پر ڈالتے ہیں کیونکہ ان کی قیمتیں زیادہ ہوتی ہیں اور دوسرا بوجھ وہ جسم پر ڈالتے ہیں اور وزن بڑھاتے ہیں۔ ان کے اندر چونکہ مٹھاس کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ جسم کو موٹا کرتے ہیں۔ موٹاپے کا سب سے پہلا حملہ عمر رسیدہ لوگوں اور بوڑھوں میں پیٹ اور کمر پر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ وہ جسمانی نظام کو ٹھنڈک بہم بھی نہیں پہنچاتے۔

فی الحقیقت سر بند مشروبات ایک خالص مغربی تصور ہے کیونکہ مغرب میں قدرتی مصنوعات کی قلت ہے اور ان لوگوں کو ضرورتاً سر بند مشروبات اور مخصوص فلیور والے شربت وغیرہ تیار کرنے پڑتے ہیں اور ہمارے لیے یہ بات بالکل بے معنی ہے کہ ان چیزوں کو بغیر کسی خاص فائدے کے اپنے لیے ہی اپنا لیں لیکن ایک چیز جو ان مشروبات کو زبردست پیمانے پر پبلسٹی کے نتیجے میں اور ان کی عموماً اور آسان دستیابی کے نتیجے میں ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اب تمام لوگ اپنے مشروب میں کسی نہ کسی قسم کے مزے دار فلیور کے متلاشی رہتے ہیں خواہ یہ مشروب گھر میں بنایا گیا ہو یا بازار سے خریدا گیا ہو۔ سب کو اس کے ذائقے میں ایک خاص قسم کے فلیور اور مزے کی طلب محسوس ہوتی ہے۔ لوگ نئے نئے ذائقے تلاش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں شاید صرف آم کو استثنائی حیثیت حاصل ہے۔ آم کا مشروب گھر پر ہی تیار کیا جاتا ہے۔

یہاں ہم کچھ ایسی ترکیبیں پیش کر رہے ہیں جن کے ذریعے کسی معمولی مشروب کو غیر معمولی بنایا جا سکتا ہے۔

پانی:

آیئے ہم پیاس بجھانے والی سب سے پرانی، تاریخی اور آفاقی شے سے اس کام کا آغاز کرتے ہیں اور یہ شے ہے پانی۔ دنیا کی کوئی بھی شے انسان کی پیاس کو اس طرح نہیں بجھاتی جس طرح ایک گلاس ٹھنڈا اور صاف پانی۔ اس بات سے تو سبھی لوگ واقف ہیں کہ گرمیوں کے موسم میں خاص طور سے پانی ابال کر استعمال کرنا چاہیے تاکہ پانی میں موجود سارے جراثیم مر جائیں جو گرمی کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ ابلے ہوئے پانی کو دس سے بارہ گھنٹوں تک کے لیے جالی دار کپڑے سے ڈھک کر الگ رکھ دینا چاہیے تاکہ یہ بالکل ٹھنڈا ہو جائے اور اس کا گمشدہ ذائقہ بھی دوبارہ واپس آ جائے۔ ورنہ اس میں پکائے جانے کی بو بسی رہے گی۔

پانی کے ایک گلاس کو کئی مختلف طریقوں سے زیادہ مزے دار بنایا جاسکتا ہے۔ ہر روز پانی میں نیا ذائقہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔اس کے لیے پانی میں مختلف چیزیں شامل کی جا سکتی ہیں جو پانی میں مختلف ذائقے پیدا کرنے کا سبب بنیں گی۔ پانی میں الائچی چھلکوں سمیت، لونگ، دارچینی، زیرہ، سونف، ادرک، پودینے یا لیموں کے پتے، کستوری کے بیج اور بعض اقسام کی خوردنی گھاس کو بھی پانی میں ڈالا جاتا ہے اس سے پانی میں ایک خاص قسم کا فلیور پیدا ہوتا ہے۔

ایشیائی ریگستانی علاقوں میں پتلی گردن والے مٹی کے مرتبانوں (صراحی) میں لوبان ڈال کر انھیں سختی کے ساتھ بند کر دیا جاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد ان کو کھول کر اسی میں ٹھنڈا پانی بھر دیا جاتا ہے۔اس خاص خوشبو والے پانی کو پسند کرنا یا نہ کرنا اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔لیکن یہ رواج ہے۔

ناریل کا پانی:

ناریل کا پانی قدرت کا ایک خصوصی تحفہ ہے۔ ناریل کے اندر بند پوری میں محفوظ پانی وٹامنز سے بھرپور ہوتا ہے اور گرمی کی وجہ سے ضائع ہو جانے والی توانائی کو پوری طرح سے بحال کر دیتا ہے۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ ناریل کو توڑنے کے بعد اس کا پانی فوراً پی لیا جائے اور اگر اس کا ذخیرہ کرنے کی ضرورت ہو تو اس کو صاف ستھرے برتن میں رکھنا چاہیے۔

بہت سے لوگ ریفریجریٹر میں رکھا ہوا ناریل کا پانی پسند نہیں کرتے۔ یہ لوگ ناریل کے پانی کے برتن کو ایک ایسے بڑے سے پیالے میں رکھ سکتے ہیں جس میں ٹھنڈا پانی بھرا ہوا ہو۔اگر ناریل کے پانی میں مٹھاس ذرا کم ہو تو اس میں تھوڑی سی پسی ہوئی ادرک، حسب ذائقہ شکر اور چند کالی مرچیں ملا دی جاتی ہیں۔اس طرح تیار ہونے والا یہ مشروب یقیناً بہت خوش ذائقہ ہو جاتا ہے۔

ماہرین غذا، ڈاکٹر اور صحت کے ماہرین سب کے سب کچھ ناریل کو بہت زیادہ مفید قرار دیتے ہیں۔ یہ پیاس بجھانے میں زبردست اثر رکھتا ہے۔ ناریل کا پانی آپ گرمی کے موسم میں زیادہ سے زیادہ استعمال کر سکتے ہیں اور یہ جلتی اور تپتی ہوئی دوپہروں میں شدید پیاس میں تسکین دیتا ہے۔اس کے پینے سے تو پیاس ایسے غائب ہو جاتی ہے جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

ناریل خریدتے وقت اس بات کا خیال رکھیے کہ آپ صرف وہی ناریل خریدیں جو کہ سائے میں رکھے ہوئے ہوں اور ایسے ناریل مت خریدیں جو کہ دھوپ میں رکھے ہوئے ہوں۔کھلی دھوپ میں رکھے ہوئے ناریل اندر سے خراب ہو جاتے ہیں۔ان میں پانی بھی کم ہو جاتا ہے اور یہ خشک بھی ہو جاتے ہیں۔

دہی:

دہی کو خاندان کی پسند کے مطابق مختلف موٹائی میں جمایا جاسکتا ہے اور اس میں مختلف قسم کا فلیور بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ تاہم خالص دہی کو مشروب قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ بہت گاڑھا ہوتا ہے۔لیکن دہی سے دیگر مشروبات تیار کیے جاتے ہیں مثلاً میٹھی یا نمکین لسی اور یہ لسی حسب خواہش گاڑھی یا پتلی ہو سکتی ہے۔

اس میں دودھ یا پانی کی مقدار میں اپنی مرضی کے مطابق کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ دہی کو خالص حالت میں ذرا سا نمک یا شکر ملا کر کھایا جاسکتا ہے۔ دن میں ایک بار ایک پیالہ دہی کھانے سے گرمی کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ دہی بھی پیاس کو دور کرنے والی شے ہے۔

دہی سے لسی کے علاوہ چھاچھ بھی تیار کی جاتی ہے اور اس کا استعمال بھی گرمیوں میں زیادہ ہوتا ہے۔ جب دہی میں مکھن بھی شامل ہوتا ہے اور اسے مکھن کے ساتھ ہی بلویا جاتا ہے تو اس سے لسی تیار ہوتی ہے اور جب دہی سے مکھن نکال لیا جاتا ہے تو یہ چھاچھ بن جاتی ہے۔

لسی میں بالعموم ہلکی یا تیز مٹھاس شامل کی جاتی ہے۔ اس کا انحصار اپنی اپنی پسند پر ہوتا ہے اور نمکین لسی کا بھی رواج بہت عام ہے۔ لسی کافی ثقیل ہوتی ہے اور اس کے پینے سے پیٹ بھر جاتا ہے جبکہ

چھاچھ پتلی ہوتی ہے اور بالکل ثقیل نہیں ہوتی۔ وہ کوئی بھاری پن پیدا نہیں کرتی۔ بہت سارے لوگ ثقیل کھانے کے بعد چھاچھ پیتے ہیں جس سے انھیں بہت فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اسی چھاچھ سے بہت سارے مختلف النوع مشروبات تیار کیے جا سکتے ہیں اور ہر بار ایک نیا مشروب تیار کیا جا سکتا ہے۔ سادہ چھاچھ میں نمک، ہرا دھنیا، ادرک اور کری پتا ملا کر اس کو ایک بالکل نئی شکل دی جا سکتی ہے۔ ہندوستان کے جنوبی علاقے میں چھاچھ کی یہ شکل عام طور سے مروج ہے۔

اس کو تیکھا بنانے کے لیے اس میں ہری مرچیں، کالی مرچیں اور پسا ہوا زیرہ ملایا جا سکتا ہے۔ اس کو لہسن، سرسوں، زیرے اور ہینگ کے ساتھ گھی کا بگھار دینے کا بھی رواج ہے۔ اس طرح ایک بالکل ہی دوسرا مشروب تیار ہو جاتا ہے۔

تازہ پھلوں کے جوس، یعنی ''رس'':

ہم میں سے ہر شخص اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ پھلوں کے رس ہمیشہ لوگوں میں بہت مقبول رہے ہیں اور خاص طور پر گرمی کے موسم میں ان کی مقبولیت اور طلب میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایشیائی ممالک میں آم، تربوز، سیب، انگور، انناس، موسمی، سنگترے وغیرہ ان پھلوں میں شامل ہیں جن کے رس سے تیار کردہ مشروبات بہت زیادہ مقبول ہیں یہ سارے مشروبات عام طور پر گھروں میں تیار کیے جاتے ہیں اور بازاروں میں بھی دستیاب ہیں۔

رامین اُسامہ

کچن کارنر

گرمی کے موسم میں دن بہت طویل ہوتے ہیں۔شام کی چائے پر بھوک چمک اٹھتی ہے۔آیئے آج کی چائے کو پرلطف بنائیں۔

گول گپے یا پانی پوری

اجزا: سوجی ایک کپ، میدہ ایک کپ، ماش کی دال کا آٹا دو کھانے کے چمچ، میٹھا سوڈا (ایک چمچ چائے کا)، پانی گوندھنے کے لیے،تیل ڈیپ فرائی کے لیے۔

فلنگ کے لیے: آلو ایک کپ ابلے ہوئے، کابلی چنے دو کپ (ابلے ہوئے) پانی ایک لیٹر، املی کا گودا آدھا کپ، دھنیا ایک چائے کا چمچہ (بھنا ہوا اور پسا ہوا)، زیرہ ایک کھانے کا چمچہ (بھنا اور پسا ہوا) لال مرچ پسی ہوئی آدھ چائے کا چمچ، نمک آدھ چائے کا چمچ، ادرک دو کھانے کے چمچ (کٹی ہوئی) لیموں کا رس تین کھانے کا چمچ۔

ترکیب: کھٹے پانی کے لیے (۱) بلینڈر میں پودینہ کے پتے ہری مرچ اور کٹی ادرک ڈال کر اچھی طرح پیس لیں۔

(۲) اب اس پیسٹ کو پانی میں شامل کر دیں۔

(۳) ساتھ ہی املی کا گودا، بھنا اور پسا دھنیا، پسا زیرہ، پسی لال مرچ، نمک اور لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔

(۴) اس کے بعد کھٹے پانی کو چھان کر فرج میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔

گول گپے کے لیے: ایک پیالے میں سوجی، میدہ اور ماش کی دال کا آٹا مکس کریں، پھر اسے حسب ضرورت میٹھا سوڈا ڈال کر گوندھ لیں، آٹے کو تیس منٹ کے لیے رکھ دیں پھر اسے دوبارہ گوندھ لیں۔اب ہتھیلی پر تھوڑی چکنائی لگا کر چھوٹے پیڑے بنائیں، ہر پیڑے کو چھوٹی پوری کی شکل میں بیل لیں اور گیلے کپڑے کے درمیان میں دس منٹ کے لیے رکھ دیں۔آخر میں اسے گرم تیل میں ہلکی آنچ پر فرائی کریں کہ پھولنے لگیں۔پھر آنچ تیز کر کے کرسپی ہو جانے تک فرائی کریں۔

پیش کرنے کے لیے: انگوٹھے کی مدد سے ایک گول گپے میں سوراخ کریں۔اس میں ابلے ہوئے آلو اور پانی میں دس منٹ تک بھیگے ہوئے چنے بھریں۔اگر میٹھی چٹنی پسند ہو تو املی کی میٹھی چٹنی بھی ڈالیں۔آخر میں کھٹے میٹھے پانی کے ساتھ پیش کریں۔

دہی بڑے

اجزاء: دہی کے لیے: دہی ایک کلو، نمک دو چائے کے چمچ، لال مرچ ڈیڑھ چائے کا چمچ، سفید زیرہ دو چائے کے چمچ، پانی دو کپ۔

بڑوں کے لیے: بیسن ۲۵۰ گرام، مسور کی دال ۱۲۵ گرام، سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ، لال مرچ ایک چائے کا چمچ، نمک ڈیڑھ چائے کا چمچ، ہری مرچ چھ عدد باریک کاٹ لیں۔

ترکیب: دہی کو خوب پھینٹ کر اس میں پانی، لال مرچ، نمک، سفید زیرہ، ڈال کر ایک بار پھر سے خوب ملا کر رکھ دیں۔اب دال کو ابال کر بالکل نرم کر لیں۔ٹھنڈی کر کے بیسن میں ڈالیں۔ساتھ ہی لال مرچ، نمک، ہری مرچ، سفید زیرہ پسا ہوا ملا کر پانی ڈال کر گاڑھا آمیزہ بنالیں۔اب ایک کڑاہی میں کوکنگ آئل گرم کریں۔جب گرم ہو جائے تو ایک بڑے چمچ سے اس میں بڑے ڈالیں۔جب ایک طرف سے سرخ ہو جائیں تو پلٹ دیں۔پھر ایک ڈش میں نکال کر اوپر سے دہی ڈالیں۔چاہیں تو ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا ڈال کر چاٹ مصالحہ ڈال لیں۔

نوٹ: اس میں باریک کٹے ہوئے ابلے آلو، کدوکش کی ہوئی مولی، گاجر، چقندر ڈال کر گارنشنگ کریں۔مزیدار دہی بڑے تیار ہیں۔شام کی چائے کے ساتھ پیش کریں۔

عبادت

ہم چالیس چالیس سال عبادت کرنے کے باوجود اس عبادت کے اثرات سے ''محفوظ'' کیوں رہتے ہیں، ہم نیکی اور پارسائی کے دریا میں غوطے لگانے کے باوجود سوکھے کیوں رہتے ہیں؟

مجھے دعا کرنے کا اصل طریقہ ایک ٹرینر نے سکھایا تھا، یہ جسمانی ورزش کا استاد تھا اور میرے جیسے مڈل ایج لوگوں کو ایکسرسائز کے طریقے سکھاتا تھا۔

میں اکثر سوچتا تھا ہم میں سے اکثر لوگ پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں گھنی داڑھی رکھنے کی توفیق بھی دیتا ہے، ہم وضو میں بھی رہتے ہیں، ہم عمرے بھی کرتے ہیں، حج کی سعادت بھی کثرت سے حاصل کرتے ہیں اور زکوٰۃ بھی دیتے ہیں لیکن اس عبادت اور ریاضت کا ہماری ذات پر کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ ہم چالیس چالیس سال کی نمازوں کے بعد بھی متشدد ہوتے ہیں، ہم شیعہ اور سنی ہوتے ہیں، ہم جاہل بھی رہتے ہیں، ہم جی بھر کر منافع بھی کھاتے ہیں، ہم ذخیرہ اندوزی بھی کرتے ہیں، ہم کم بھی تولتے ہیں، ہم کم بھی ناپتے ہیں، ہم دودھ میں پانی بھی ڈالتے ہیں، ہم جعلی ادویات بھی بناتے ہیں اور ہم اپنے ملازمین کا حق بھی مارتے ہیں۔ میں سوچتا تھا ہماری نمازیں، روزے اور حج ہماری ذات پر اثر کیوں نہیں چھوڑتے جبکہ اللہ تعالیٰ دعویٰ کرتا ہے مومن بے ایمان نہیں ہوسکتا، مومن سخت گیر بھی نہیں ہوسکتا، مومن بے انصاف اور منافق بھی نہیں ہوسکتا اور مومن متشدد اور انتہا پسند بھی نہیں ہوسکتا لیکن مومن ہونے کے باوجود ہم میں اسلام کی کوئی صفت دکھائی نہیں دیتی، کیوں؟ ہم اپنے اسلام سے اپنے بھائیوں اور بہنوں تک کو متاثر کیوں نہیں کر پاتے؟ میں اکثر سوچتا تھا، پریشان ہوتا تھا اور پھر دوسرے بے بس اور کم عقل مسلمانوں کی طرح اسے ایمان کی کمزوری قرار دے کر خاموش ہو جاتا تھا لیکن پھر مجھے وہ ٹرینر ملا اور اس نے میرے ذہن کی ساری گرہیں کھول دیں۔ اس نے بتایا ایکسرسائز کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے آپ جب کسی مسل کی ایکسرسائز کریں تو آپ دوران ایکسرسائز اس مسل کے بارے میں سوچیں۔ اس کا کہنا تھا مثلاً آپ اگر بازوؤں کی ایکسرسائز کر رہے ہیں، آپ بازوؤں کی مدد سے وزن اٹھا رہے ہیں تو آپ کو اپنی ذہنی یکسوئی بازوؤں پر رکھنی چاہیے، آپ کے بازوؤں کے مسل بہت جلد ڈویلپ ہو جائیں گے، اسی طرح آپ چھاتی کی ایکسرسائز کر رہے ہوں تو ایکسرسائز کے دوران چھاتی کے بارے میں سوچیں، آپ کی چھاتی کے مسل پھیل جائیں گے۔ اس کا کہنا تھا ہمارا دماغ طاقت کا ہیڈ کوارٹر ہوتا ہے، ہم جب اس ہیڈ کوارٹر کے بغیر ایکسرسائز کرتے ہیں تو ہمارے مسلز پر وزن، بوجھ یا کھچاؤ تو آتا ہے لیکن انھیں طاقت نہیں ملتی چنانچہ یہ اس رفتار سے نہیں بڑھتے جس رفتار سے ہم انھیں بڑھانا چاہتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا ہم جب اپنے بازوؤں پر وزن ڈالتے ہوئے بازوؤں کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمارے ہیڈ کوارٹر میں جمع طاقت بازوؤں پر شفٹ ہو جاتی ہے اور یوں بازوؤں کو اندر اور باہر دونوں طرف سے طاقت ملتی ہے اور ہمارے بازوؤں کے مسل پھیلنے لگتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا یکسوئی کے بغیر بھی مسل پھیلتے ہیں لیکن ان کے پھیلنے کی شرح محض ۳۰ فیصد ہوتی ہے اور ہم اگر اس ۳۰ فیصد میں دماغ یا یکسوئی کا ۷۰ فیصد شامل کر لیں تو ہمارے نتائج سو

فیصد ہو جائیں گے۔

لیکچر محض ایکسر سائز کے بارے میں تھا لیکن اس لیکچر کے دوران مجھ پر عبادت اور دعا کی رمز بھی کھل گئی۔ میں جان گیا ہم چالیس چالیس سال عبادت کرنے کے باوجود اس عبادت کے اثرات سے ''محفوظ'' کیوں رہتے ہیں، ہم نیکی اور پارسائی کے دریا میں غوطے لگانے کے باوجود سوکھے کیوں رہتے ہیں؟ پارسائی اور عبادت ہماری ذات پر اثر کیوں نہیں کرتی؟ اس کی وجہ صرف اور صرف یکسوئی ہوتی ہے۔ عبادت کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے اور انسان کی تمام اچھائیاں بھی روح ہی میں سٹور ہوتی ہیں۔ علم ہو، سوچ ہو، ایمان ہو، صفائی ہو، شائستگی ہو، تہذیب ہو، اخلاق ہو اور سماجی، معاشی اور کاروباری اخلاقیات ہوں یہ سب انسانی روح میں جمع ہوتی ہیں، ہمیں ان میں سے چند اچھائیاں، چند خوبیاں درکار ہوتی ہیں، ہم اگر عبادت کے دوران درکار اچھائیوں کے بارے میں سوچتے رہیں، ہم انھیں اپنی یکسوئی کا حصہ بنا لیں تو مسلز کی طرح ہماری یہ اچھائیاں بھی مضبوط ہونے لگتی ہیں اور یہ چند دنوں، چند برسوں میں حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ جاتی ہیں مثلاً اگر کسی شخص کو علم چاہیے اور یہ نماز کے دوران اللہ سے علم مانگنا شروع کر دے، یہ ذہن میں علم کو رکھ کر نماز شروع کرے، یہ تسبیح کے دوران بھی اللہ سے علم مانگتا رہے، یہ وضو کرتے ہوئے، صدقہ کرتے ہوئے، دوسرے لوگوں کو راستہ بتاتے ہوئے اور روزے کے دوران اللہ سے علم مانگے تو اس کی روح میں چھپی طاقت اس کی دعا کے ساتھ شامل ہو جائے گی اور یوں اس پر علم کے دروازے کھل جائیں گے۔

اسی طرح کوئی دکاندار ایماندار ہونا چاہے، یہ ناپ، تول اور لین دین میں کھرا ہونا چاہے، یہ جعل سازی اور فراڈ سے بچنا چاہے تو یہ اس نیت کو اپنی نماز، اپنی عبادت کا حصہ بنا لے، یہ کوئی بھی تسبیح کرے لیکن نیت میں ایمانداری رکھے تو اللہ تعالیٰ اس پر ایمانداری کا سبب کھول دیتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص صاف ستھرا رہنا چاہتا ہے لیکن اس کا کام بدبودار یا گندا ہے، یہ شخص تسبیح یا نماز کے دوران صفائی کی نیت کر لے اور پوری نماز کے دوران اللہ تعالیٰ سے صفائی مانگتا رہے تو اللہ تعالیٰ اس پر بھی صفائی کے اسباب کھول دے گا لیکن یہ تمنا، یہ خواہش نیت کی شکل میں ہونی چاہیے الفاظ یا فقروں کی صورت میں نہیں ہونی چاہیے کیونکہ لفظوں اور فقروں میں بناوٹ آ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ بناوٹ کو پسند نہیں کرتا۔

میں نے اس نکتے کی آگہی کے بعد قرآن مجید، احادیث مبارکہ اور سیرت طیبہ کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا پورا قرآن مجید، احادیث اور سیرت اسی نکتے کے اردگرد پھیلی ہے، پوری نماز، پورے روزے، پورے عمرے اور پورا حج اسی نقطے کے گرد گھومتا ہے، نماز کی زبان عربی ہے اور عرب نماز کے دوران اللہ تعالیٰ سے وہ کچھ مانگتے ہیں جن کی ان کو ضرورت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان پر اسباب کھول دیتا ہے۔ ہماری زبان عربی نہیں چنانچہ ہم نے نماز رٹ رکھی ہے اور ہم یہ رٹی ہوئی نماز میکینکل انداز میں پڑھ کر واپس آ جاتے ہیں، آپ آج سے غور کریں، ہم میں سے اکثر لوگوں کا دماغ نماز کے دوران مختلف سمتوں میں بھٹکتا ہے، ہم نماز کے دوران دماغ میں کسی نہ کسی کے ساتھ مکالمہ کرتے ہیں، ہم کچھ نہ کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں، ہم پرانے حساب جوڑنے میں لگ جاتے ہیں یا بچپن کے بچھڑے ہوئے دوستوں کو یاد کرنے لگتے ہیں، ہم اگر اپنی سوچ کی زبان پر غور کریں تو یہ زبان ہماری مادری زبان نکلے گی، گویا ہم نماز عربی میں پڑھتے ہیں لیکن سوچ پنجابی، سندھی، بلوچی یا پشتو میں رہے ہوتے ہیں اور ہماری یہ سوچ کیا ہوتی ہے؟ یہ جو بھی ہو یہ طے ہے اس کا تعلق نماز کے ساتھ نہیں ہوتا چنانچہ نماز کے دوران ہماری سوچ بھٹکتی رہتی ہے اور ہم اس دوران روبوٹ کی طرح میکینکل نماز ادا کرتے رہتے ہیں، ہم امام صاحب کے پیچھے خودکار نظام کے تحت رسومات ادا کرتے جاتے ہیں اور پنجابی میں دنیاداری کے بارے میں سوچتے جاتے ہیں۔ اور یوں ہم خود کو بہتر بنانے کا موقع کھو دیتے ہیں۔

ہمارے پاس اپنی عبادت کو بہتر بنانے یا اس سے زیادہ سے

زیادہ نتائج حاصل کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ہم نماز کو پوری طرح سمجھ کر ادا کریں، ہمیں ایک ایک لفظ کی سمجھ آ رہی ہو اور ہم اپنی خواہشوں، اپنی نیتوں کو ان لفظوں کے ساتھ جوڑ رہے ہوں، ہم علم، خوشحالی، ایمانداری اور صفائی کو سورۂ کوثر کے ساتھ شامل کر رہے ہوں تو مجھے یقین ہے ہمارے اسباب کھل جائیں گے۔ دوسرا ہم نماز عربی میں ادا کریں لیکن اپنی خواہش، اپنی نیت اور اپنی دعا کو اپنی مادری زبان میں اس کے ساتھ جوڑ دیں، ہم خیال کو زیادہ نہ بھٹکنے دیں، ہم اسے اپنی دعا کے قریب قریب رکھیں، ہم اگر علم چاہتے ہیں تو ہم اس علم کی نیت لے کر مسجد جائیں اور نماز کے دوران اپنی اس نیت کو تازہ رکھیں، ہماری سوچیں، ہمارے خیالات اس نیت کے ساتھ جڑے رہیں، اللہ تعالیٰ کرم کرے گا۔

میں اللہ کے کرم سے پچھلے ۱۶ برس سے اس فارمولے کے تحت تسبیحات کر رہا ہوں اور میں نے ان تسبیحات کے دوران اللہ تعالیٰ سے جو بھی مانگا اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور مجھے عنایت کر دیا اور اس عنایت میں ایسی ایسی خامیوں سے چھٹکارا بھی شامل ہے جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ یہ میری فطرت کا حصہ ہیں اور انسانی فطرت تبدیل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے میری ان خامیوں کو خوبی میں بدل دیا۔ چنانچہ آپ میرے تجربے کی بنیاد پر یہ فارمولا استعمال کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ پر بھی کرم کرے گا۔

(روزنامہ ایکسپریس)

بتول میگزین

بنئے ! کچن کوئین

(عظمیٰ آفرین، کراچی)

آج کل تو ٹی وی ڈراموں سے زیادہ کوکنگ پروگرامز پرزور ہے۔انھیں دیکھ کرنہ صرف خواتین کواچھا کھانا بنانے کا شوق ہوگیا ہے بلکہ وہ بہت حدتک اس مشکل میں کامیاب بھی رہتی ہیں ویسے بھی مشترکہ خاندانی نظام کارواج ختم ہوگیا ہے، گھر کی بزرگ خواتین کی جگہ ٹی وی کے شیفس اور کوکنگ ایکسپرٹس نے لے لی ہے۔اوراب ہر خاتون اپنے آپ کوان ہی کی طرح ماہر دیکھنا چاہتی ہے تو جناب ہم آج آپ کوایسی مفید ٹپس دے رہے ہیں جنھیں اپنا کرآپ بھی اپنے گھر کی کچن کوئین بن جائیں گی۔سب سے پہلےتو آپ دنیاکے سب سے طاقتور ہتھیار پیاراورمحبت کا سہارالیں کیونکہ محنت ،لگن اور توجہ سے کیئے گئے کسی بھی کام کانتیجہ ہمیشہ شان دار ہوتا ہے۔اپنے گھر میں ریسٹورنٹ والے کھانے ضرور بنایئے مگر ان کا ذائقہ اورشکل ہو بہو ہوٹل کے کھانے جیسی نہ ہونے پردل برداشتہ نہ ہوں،اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ آپ اچھا کھانانہیں بناسکتیں۔یہ حقیقت تسلیم کریں اورگھر والوں کو بھی بارآور کرایئے کہ ہوٹل میں بنے ہوئے کھانوں میں جو تکنیک استعمال ہوتی ہیں ان کاعملاً استعمال گھرمیں ممکن نہیں۔

تراکیب پرالف سے ی تک عمل کرنے کے بجائے کبھی خود سے بھی کوئی نئی ڈش بنائیں یاکسی ترکیب میں کمی بیشی کرکے اپنی ڈش ایجاد کریں۔اس تجربے سے آپ نت نئے ذائقوں سے لطف اندوز ہوں گی۔

کھانا تیارکرتے وقت ایک اچھے کک کی طرح پانچ بنیادی نکات ضرور مدنظر رکھیں۔اول یہ کہ کھانا کم خرچ میں تیار کیا گیا ہو، دوم: کھانا آسان ترین مراحل میں تیار کیا جائے،سوم کھانا ذائقے دار ہو، چہارم: کھانا خوش شکل ہواور پنجم: کھانا حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق تیار کیا گیا ہو۔

کھانے کے ساتھ اس کی خوبصورتی اور ذائقہ بڑھانے کے لیے جہاں نفیس کراکری اورگارنشنگ کام آتی ہے وہیں پیش کیے جانے والے لوازمات بھی سادہ سی ڈش کی اہمیت کودوبالا کر دیتے ہیں جیسے کھچڑی یاسادہ دال کے ساتھ اچار، چٹنیاں، پاپڑ، تلی مرچیں اورسلادکو لازمی جزبنالیں۔

سب سے آخری مگر اہم نکتہ یہ ہے کہ جو بھی ڈش بنائیں اس کو مکمل سلیقے سے پیش کریں اورگھر کے تمام چھوٹے بڑوں، خاص طور پر بچوں اور بزرگوں کی پسند اور صحت کو لازمی مدنظر رکھیں، کیونکہ دونوں ہی کوخاص قسم کی غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کے علاوہ رزق کو ضائع ہونے سے بچائیں کیونکہ اللہ کے نزدیک یہ ناپسندیدہ عوامل میں سے ایک ہےاورگھر کی مالکہ ہونے کی حیثیت سے یہ آپ کی ذمہ داری اورفرائض میں بھی شامل ہے۔

☆☆☆

کلام اللہ کی برکت

(ام صائم، لاہور)

خالہ کلثوم مجھے بار بار آوازیں دیتی جارہی تھیں میں نے نیچے جھانک کر دیکھا اور پوچھا! جی خالہ جی۔ کہنے لگیں نیچے آ ؤ میری بہن پنڈی سے آئی ہے تمھیں ملوانا ہے۔ میں نے اچھا کہا اور جلدی جلدی

کام نبٹا کر اُن کے گھر اُن کی بہن سے ملنے چلی آئی۔ ہم اُن کے سامنے والے گھر کے اپر پورشن میں رہتے تھے اور وہ اپنے دروازے میں کھڑی ہوکر اکثر مجھے آواز دیتیں اور میں کھڑکی سے جھانک کر اُن کا حال احوال پوچھ لیا کرتی۔

تھوڑی دیر میں میں ان کے گھر تھی۔ اُن سے باتیں کرتے کرتے اللہ کے کلام کی برکتوں کا ذکر چل پڑا۔ خالہ کلثوم کی بہن بتانے لگیں کہ ان کا بیٹا عامر اُن دنوں تقریباً پندرہ سال کا میٹرک کا طالب علم تھا جب اُسے گردن توڑ بخار ہوا۔ عامر ہسپتال میں داخل تھا کبھی بلڈ ٹیسٹ ہو رہے ہیں، کبھی کوئی اور ٹیسٹ جو بھی ڈاکٹرز کے اختیار میں تھا وہ کر رہے تھے لیکن تکلیف بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

آخر کار ڈاکٹروں نے جواب دے دیا کہ آپ اسے گھر لے جائیں اور دعا کریں اب اس کا بچنا مشکل ہے ظاہر ہے وہ ماں تھیں اور جوان بیٹا بستر مرگ پر تھا۔

ویسے تو ہر انسان ایسے حالات میں کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے لیکن جب ہر طرف سے مایوس ہو جائے تو اللہ کے سوا کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ وہ کہنے لگیں کہ میں نے درودِ ابراہیمی کا ورد شروع کر دیا اور میں اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر درود پڑھتی اور دعا کرتی گئی کہ اللہ جس طرح تو اپنے نبیؐ پر رحمتیں اور برکتیں نازل فرماتا ہے اُن کا کچھ حصہ میرے بچے پر بھی نازل کر اور پھر میں تصور میں دیکھتی کہ آسمان سے رحمتوں اور برکتوں کا نور نازل ہو رہا ہے اور اسی طرح سر کے پیچھے سے ہاتھ لا کر کمر تک اور پھر ہاتھ جھاڑ دیتی کہ اللہ تو میرے بیٹے کو اس بیماری سے اس درود پاک کی فضیلت اپنی رحمتوں اور برکتوں کے وسیلے سے نجات دے دے۔ ماں تھی اور کوئی آسرا نظر نہ آ رہا تھا ساری رات بس ایسے ہی کرتی رہی۔

فجر ہوتے ہوتے اللہ نے ایک ماں کی دعا سن لی اور وہ بچہ زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ صبح جب ڈاکٹر کو بلایا تو وہ عامر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور اسے ہسپتال لے جانے کے لیے کہا تا کہ اُس کے کچھ ٹیسٹ وغیرہ کروالیں۔

جب عامر کے سارے ٹیسٹ بالکل ٹھیک آئے تو ڈاکٹر نے عامر کی والدہ سے پوچھا کہ آپ نے اسے کون سی دوائی دی تو عامر کی والدہ نے انھیں ساری بات بتائی تو ڈاکٹر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ تو کرامت ہو گئی۔ (سبحان اللہ)